ہماری زبان میں عہدِ عتیق کی تاریخ پر بہت کم کتابیں ہیں، تمدنِ عتیق میں لائق مؤلفین نے آغازِ آفرینش سے لیکر بخت نصر تک کے مختصر حالات جمع کر دیئے ہیں، ابتدائی ابواب میں تخلیقِ عالم کی سرگذشت ہے، کہ کس طرح زمین بنی، اور پھر بتدریج اس پر کیسے زندگی، اور پھر انسانی زندگی کا ظہور ہوا، پھر قدیم وجدید، عہد حجری کے انسانوں کے حالات، ان میں تخیلات وعقائد کی ابتدا، اور تحریر کا آغاز ہے، پھر تمدن کے ابتدائی دوروں میں ہندوستان سامرستان اور مصر کے حالات، اور یہاں کے باشندوں کے مذہبی اور ادبی رجحانات، ان کے علوم وفنون طبقاتی نظام کاروباری زندگی، قوانین اور اقتدار شاہی کی تاریخ ہے، پھر مصر قدیم کی تاریخ، اور قدیم آشوری کلدانی اور عبرانی حکومتوں کے عروج وزوال، سیاسی انقلابات اور جنگ وجدال کی سرگذشت ہے، گویہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت مختصر ہے تاہم اس کے پڑھنے سے سرسری اور اجمالی حالات ذہن میں آجاتے ہیں، زبان کہیں کہیں کھٹکتی ہے،

البرہان للتحقیق الاظہر فی فضائل الصدّیق والعمر } مؤلفہ جناب غلام یٰسین خاں صاحب قائم خانی جمعدار رسالہ آصفجاہی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۴ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں، پتہ محلہ کھو کھرواڑی اندرون بلدہ حیدرآباد دکن،

مؤلف نے اس رسالہ میں اہلِ سنت کی حدیث کی کتابوں سے شیخین کی فضیلت میں اہلِ بیت کرام کی روایات اور شیعوں کی معتبر کتابوں اور ان کے ائمہ اور اکابر کے اقوال سے صحابۂ کرام اور حضرات شیخین کے فضائل جمع کئے ہیں، ہر روایت کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے، ترجمہ کی زبان پرانی ہے، البتہ والعمر کی عربی ترکیب نئی ہے،

(م)

جلد ۳۹ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۷ء | عدد ۲

مضامین

شذرات

دکن کا جشنِ سیمین

یہ رسالہ جب آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم حضور پرنور فرمانروائے کشورِ دکن و برار خلد اللہ ملکہ کا جشنِ سیمیں ممالکِ محروسہ اور بیرونِ ممالک میں شروع ہو چکا ہوگا، اعلیٰحضرت کے دورِ حکومت کو فرمانروایانِ آصفیہ کے درمیان وہی امتیاز ہے جو خلیفہ مامون الرشید کے عہد کو خلفائے عباسیہ کے درمیان، علوم و فنون کی اشاعت، تعلیم کی ترقی، عمارات کی تعمیر، دفاتر کی تنظیم، نظم و نسق کی درستی، رعایا کی خیر خواہی اور ان کی بھلائی کی مفید تجویزیں عہدِ عثمانی کے خاص برکات ہیں،

یہ بھی عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ عین اُس وقت جب حضور کے بست و پنج سالہ عہدِ حکومت کا جشن منایا جانے والا تھا، دولتِ آصفیہ کا پرچم ایک نئے ملک پر جو تقریباً اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، پھر لہرانے لگا، یہ مصالحانہ فتح اعلیٰ حضرت کے ناخنِ تدبیر اور وزرائے آصفیہ کے حسنِ سعی سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اس سلطنت کے سیاسی حدود سے وسیع تر اُس کے علمی و تعلیمی حدود ہیں، جو ہمالیہ کی چوٹیوں سے لیکر بحرِ شور کے کناروں تک پھیلے ہیں،

اس جشنِ سیمیں کے ابرِ گہر بار کے چند سیمیں چھینٹے دار المصنفین کے دامن تک بھی پہنچے ہیں، اعلیٰ حضرت نے پانچ برس کے لئے دار المصنفین کی دو سو ماہوار کی مزید امداد منظور فرمائی ہے، اور گذشتہ دو برس چند مہینوں کی رقم چھ ہزار چھ سو پچاس روپے محکمۂ امورِ مذہبی کے ذریعہ سے دار المصنفین کو عطا کر دی گئی ہے، دار المصنفین ہر چند دکن سے دور ہے،

مگر اس میں شبہہ نہیں کہ اس کی سیرابی دکن ہی کے چشمۂ حیات سے ہے،

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را

نظام الملک آصفجاہ عثمان علی خاں را

گذشتہ ۱۶-۱۷-۱۸ جنوری ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ کی نمائشگاہ میں ہندوستانی اکاڈیمی کی ادبی کانفرنس کے جلسے ہوئے، حسب دستور پہلا اجلاس اردو و ہندی کا مشترک تھا، جس میں صدارتی خطبے پڑھے گئے، اور باقی دنوں میں اردو اور ہندی کے الگ الگ جلسے ہوئے جن میں مضمون پڑھ کر سنائے گئے، اردو حصہ میں سید سجاد حیدر صاحب نے ہندوستان کیلئے رومن خط کی تجویز پیش کی، اور پروفیسر منیش پرشاد نے مرزا غالب کے سہرے پر، مجنوں گورکھپوری نے کلامِ آسی پر، مولوی احمد مکرم صاحب اعظمی نے اردو اور ہندی بھائی چارہ پر، مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے مرزا جہانگیر کے مقبرہ پر، مرزا محمد عسکری صاحب نے فسانۂ آزاد پر، ڈاکٹر آغا مہدی حسن (آگرہ یونیورسٹی) نے ہندوستان میں تاریخ نویسی پر اور مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی نے اکبر الہ آبادی کی معاشرتی شاعری پر محققانہ اور دلچسپ مضمون پڑھ کر سنائے، عثمانیہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے نمائندے شریک تھے،

ہندی اور اردو کے آسان لکھے اور بولے جانے پر سرتیج بہادر سپرو، اور صدر اردو کانفرنس اور بہت سے مقررین نے زور دیا، لیکن ہر ایک تقریر کا توڑ اس پر تھا کہ جبتک ہندو مسلمانوں کے دل نہیں ملیں گے، زبان ایک نہیں ہو سکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ دل کیونکر ملیں؟ پالٹیکس میں انکی علٰحدگی تو کھلی ہوئی ہے، لیکن انتہا یہ ہے کہ جس ادبی کانفرنس کے ذریعہ ہم ان کو ایک کرنا چاہتے ہیں اس میں بھی دونوں مل کر نہیں بیٹھے، اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب یہاں جمع تھے مگر دونوں دو خیموں میں تھے، ایک نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اور ایک دوسرے کی سننا اور سمجھنا تو بعد کی چیز ہے، کیا یہ حد درجہ افسوسناک نہیں!

پچھلے پرچہ میں شعر العجم جلد سوم کے فارسی ترجمہ کی جو خبر دی گئی تھی اس سلسلہ میں یہ مزید تفصیل معلوم ہوئی ہے کہ جلد اول و دوم و سوم و پنجم کا فارسی ترجمہ کابل میں، اور جلد چہارم کا مع رسالۂ کتبخانۂ اسکندریہ کے ایران میں ہوا ہے، اس طرح کتاب کی پوری جلدوں کے ترجمے کابل و ایران نے مل کر پورے کر دیئے ہیں،

اردو کی یہ خوش قسمتی کیا کم ہے کہ اس زبان کی تصانیف کے فارسی اور ترکی میں ترجمے ہوں، اس سلسلہ کی نئی کڑی شمس العلماء آزاد مرحوم کی کتاب سخندانِ فارس کا فارسی ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ملک الشعرائے افغانستان قاری عبد اللہ خان کے قلم کا رہینِ منت ہے،

یہ کتنے افسوس کی بات تھی کہ تاریخ ابن خلدون جیسی اہم کتاب کا کوئی صحیح اور مکمل اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، جو مطبوعہ نسخہ ہاتھوں میں ہے وہ جابجا سے ناقص اور سقیم ہے، اس سلسلہ میں معارف میں بھی ایک تحریر چھپی تھی، اب یہ خبر مسرت کیساتھ معلوم ہوئی ہے کہ آجکل اس کے ایک نئے صحیح اور مکمل نسخہ کی تیاری عمل میں آرہی ہے، مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے جو اس نے سلطانِ مغرب کو ہدیہ دیا تھا، اور جو کتبخانۂ قرویہ واقع فاس (مراکش) میں موجود تھا، اور قسطنطنیہ کے مصحح نسخہ سے جو دار الکتب مصریہ میں تھا، اور احمد تیمور پاشا مرحوم اور احمد زکی پاشا مرحوم کے نسخوں سے مقابلہ کرکے نیا نسخہ تیار کیا گیا ہے، چنانچہ موجودہ مطبوعہ تیسری جلد کے صفحہ ۲۲ سے ۶۰ صفحے ناقص پائے گئے جو اضافہ کئے گئے، اطمینان کی مزید بات یہ ہے کہ امیر شکیب ارسلان نے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، اور نئے اسلوب سے متعدد فہرستیں اس میں شامل کی گئی ہیں،

یہ نسخہ چودہ۱۴ جلدوں میں مکمل ہوگا، اور ایک ایک جلد کرکے شائع ہوگا، ہر جلد میں قریب قریب پانچسو صفحے ہونگے، اور ہر جلد کی قیمت چار روپیے ہوگی، اور ہندوستان میں مکتبہ عربیہ اور مینٹ ہوٹ بلڈنگ کرافٹ مارکٹ بمبئی ۳ سے ملے گی،

مقالات

خطبۂ صدارت

ہندوستانی اکاڈیمی اردو کانفرنس لکھنو

منعقدہ ۱۶،۱۷ جنوری ۱۹۳۷ء

لکھنؤ سے نسبت، شرفائے علم و ادب! اگر مفرمائی کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی و ادبی مجلس میں ایک حقیر کو پائین سے اٹھا کر صدر میں بٹھایا، آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی ہے، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو گو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں، لیکن گذشتہ چھتیس برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اسلئے اس سرزمین کا ہر گوشہ، میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظار افروز ہے،

مفارقت کے داغ، خوشی اور غم توام ہیں، اس خوشی کے موقع پر ان چند دوستوں کی یاد آتی ہے، جو اس سال ہمکو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گئے، اور جو خود اس بزم ادب کے رُکنِ رکین اور باعثِ تزئین تھے، منشی پریم چند کا ماتم اسوقت تک رہے گا، جب تک ہماری زبان میں ان کی کہانیوں کا ایک ورق بھی باقی ہے، وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے

دکھ درد کو انکا دل جو محسوس کرتا تھا، وہ ان کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی، انکا قلم ہمارے پرانے کیرکٹر اور قومی آن بان کا سچا قدردان تھا،

اصغر مرحوم کی یاد دل سے کوئی کیونکر بھلائے، گو اُن کے جسمِ خاکی کا وطن گونڈا تھا، مگر انکی شاعرانہ مقبولیت کا وطن اعظم گڈہ تھا، اسی ویرانہ سے ان کی شہرت کی بو نکل کر ملک کے چمن زاروں تک پہنچی یہیں انکا پہلا دیوان مرتب ہوا، وہیں ان کے شاعرانہ امتیازات کے جوہر کھولے گئے، اور وہیں سے انکا نشاطِ روح مطبوع ہو کر نشاطِ عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے اُن شعرا میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رُخ پلٹا ہے، اور ایک نئے دورِ سخن کا آغاز کیا ہے،

ان جوانوں کے ساتھ بوڑھے نیّر کے فضل وکمال سے ہماری محرومی بھی اس سال کا افسوسناک حادثہ ہے، وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، اور خود بھی شاعر اور شاعر سے بڑھکر محققِ فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات انہی کے آزمودہ کار ہاتھوں نے ترتیب دیا، سب سے آخر میں لکھنؤ کے مایہ ناز ادیب شاعر و مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خان طاہر کا ماتم کرنا ہے، جن کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا،

لکھنؤ کے خدمات

آج ہم جس تاریخی شہر میں جمع ہیں، وہ گو ہمارے پورے ملک کی پوری راجدھانی کبھی نہیں بنا، لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ وہ ہمارے علوم و فنون اور شعر و ادب کا مدتوں پایۂ تخت رہا ہے، اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جنکا ٹیلہ اور ٹیلہ پر والی مسجد مشہور ہے، وہ یہاں کے سب سے پہلے عالم ہیں، عالمگیر کے عہد میں سہالی سے فرنگی محل کو علم و فن کا وہ خاندان منتقل ہوا جو صدیوں تک ہمارے علوم و فنون کا محافظ اور شیرازِ ہند پورب کا دار العلم رہا، اور اس نئے زمانہ میں مسلمانوں

کی نئی عربی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی یہیں نبیاد پڑی، یہاں کا خاندانِ اجتہاد پورے ملک کے طول و عرض پر تنہا حکمراں ہے،

دلی کے باغ میں جب خزاں آئی، تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اُجڑے باغ کے کتنے مرغِ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو دکن اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا،

اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی، تو اوسکو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میر، انشاء اللہ خان انشاء، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے ادھر کا رُخ کیا، میر انیس کا خاندان دلی سے پہلے ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امرا کی ڈیوڑھیاں اور اہلِ علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پُرشور بن گئیں، ناسخ و آتش، وزیر و صبا، اور ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعر و ادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دیئے،

شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے تفریحی جمگھٹوں کو چھوڑ کر نفسِ زبان کی ترقی، محاورات کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اوسی کا اثر ہے، کہ اس نے بولی سے بڑھکر زبان کا درجہ پایا، ملکِ سخن کے دو اخیر فرمانروا انیس و دبیر نے شاعری نہیں کی، بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہلِ ملک میں تقسیم کرتے رہے،

ناسخ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا، جو ہر ایک ہوشیار جوہری، جواہرات کے نوک و پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، اون کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط، ثقیل و سبک لفظوں کو اس طرح پر لکھکر الگ کر دیا، کہ انکی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ

جوگو بول چال میں رائج تھے، مگر شعر وانشاء کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے بچھوں کے لئے سند پیدا کی، لکھنؤ میں غالباً یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے سنہ ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا، جس کا نام نفس اللغۃ ہے، سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا،

شیخ امداد علی بحر المتوفی سنہ ۱۳[illegible]ھ کی نسبت بھی مشہور ہے، کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا، مگر اس کا سراغ نہیں ملتا،

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے، ان شعراء میں ہیں جنھوں نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالامال کیا ہے، سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعراء، تنقیح اللغات، گلشن فیض، قواعد المنتخب وغیرہ انکی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے، افسوس ہے کہ اردو کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصے الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے، ان کے جلیل القدر شاگرد نواب فصاحت جنگ جلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے، کہ رامپور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ہماری زبان کی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازار میں بھی مشتاقوں کی آنکھیں اس عروس فن کی دید سے محروم رہیں،

لکھنؤ نے شعر وسخن کے ذریعہ سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی محفلوں کی بار بار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں، اور جو شہرت کی بناپر زبان زد خاص وعام ہیں،

مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گنانی ہیں، جنکو اس دور کے قدرداں بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں،

عہد جدید کی آبادی لکھنؤ کے افق میں، ہمارے ملک میں سات سمندر پار سے آکر جب اہل یورپ نے

اپنے نئے علوم وفنون کی نمائش کی ہے، تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا، جب وہ عیش ومسرت کی شراب سے بدمست تھا، اسوقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دیساور کی نئی چیزوں کی قدر کرے، اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں جس پر ان کو بڑا غرور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے، تاہم اس میخانہ میں کچھ اہل ہوش بھی تھے، انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا اور جو چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ فرنگستان کی دوکانوں سے خرید کر لائے،

یہ سب کو معلوم ہے، کہ خاص حالات نے سرکار اودھ اور سرکار کمپنی کو متحد کر دیا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی رزیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکار اودھ کا وکیل کلکتہ میں اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے دو عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلے یہیں پیوند لگا، اس زمانہ کے رزیڈنٹ اور انگریز حکام اردو اور فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، نواب سعادت علی خان کے دربار میں بیلی صاحب رزیڈنٹ اور انشاء اللہ خاں کی ادبی نوک جھونک کی حکایتیں آب حیات کے ذریعہ مشہور عام ہیں،

سرکار اودھ کی طرف سے وکالت اور انشاء کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے، وہ عموماً اہل علم کے طبقے سے ہوتے تھے، انگریزوں کے میل جول سے وہ بھی انگریزی علوم وفنون سے آشنا ہو جاتے تھے، اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم میں مہارت پیدا کر لیتے تھے، خان علامہ تفضل حسین خاں انہی لوگوں میں سے تھے، وہ رہنے والے سیالکوٹ کے تھے، اور ریاضیات ومتوسطات کی تعلیم دلی میں پائی، لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ میں ملا حسن فرنگی محلی سے حاصل کی، پہلے نواب سعادت علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے انکو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا، اس اثناء میں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں، اور جدید ریاضیات وہیئت کو حاصل کیا، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں درس وتدریس اور تالیف وتصنیف کا مشغلہ جاری کیا، اور جدید علم ہیئت اور جبر ومقابلہ میں

کئی کتابیں تصنیف کیں، ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی،

نواب محمد علی خاں کے زمانہ میں منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی، گو انکے بزرگوں کا وطن بریلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بہار لکھنؤ میں ظاہر ہوئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کیساتھ جدید ہیئت و ریاضیات میں بھی ماہر تھے، انگریزی سیکھی تھی، حدائق النجوم انکی مشہور تصنیف ہے، ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں تالیف پائی، نئے علم کے لئے نئی اصطلاحوں کا وضع کرنا انکا خاص کارنامہ ہے، لکھتے ہیں،

"باید دانست کہ چوں ایراد الفاظ یونانی و برطانیقی (انگریزی) بعینہ در کتاب فارسی و عربی کردہ و غیر مانوس است، و کتب عرب یکسر بمذہب بطلیموس کہ فیما نحن فیہ اگرچہ بعضے مطابق با آنست لیکن بسیارے مخالف ازان و برخے مجدد کہ نشانے ازاں در تصانیف قدما پدید انیست ناچار بوضع بعضے از اصطلاحات جدیدہ یا تصرفے در تعریفات و جز آن چنانکہ عادت مترجماں قدیم ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم اقتضائے ایشاں کردہ میگویم، الخ[9]"

ان ہی لوگوں میں ایک اور قابلِ ذکر ہستی رای منوں لال فلسفی کی ہے، وطن سندیلہ تھا، فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری تصانیف کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہیئت اور حکمت، انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے، ۱۲۴۸ھ میں وفات پائی،

سرکار اودھ کی طرف سے جو علما وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، ان میں سے دو نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی مراد آباد کے رہنے والے تھے، نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے، منطق کی بعض پرانی کتابوں پر انکے حاشیے ہیں، ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، جس میں یورپ کے نئے علوم و فنون جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے،

نواب نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ان دو کے علاوہ دو اور صاحب قابلِ تذکرہ ہیں، مولوی عبد الرب اور مولوی کمال الدین حیدر، لکھنؤ میں جو یورپین علما رہتے تھے، ان سے برابر کی، ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں، اسی کا نتیجہ وہ رصد خانہ ہے، جو ۱۲۴۷ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں جنرل مکلاوڈ کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانہ میں بنکر تیار ہوا، اس رصد خانہ میں کرنل ولکاکس وغیرہ انگریز علما کے علاوہ مولوی عبد الرب صاحب، مولوی کمال الدین حیدر صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب مراد آبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس میں امپیریل بنک کی عمارت قائم ہے،

اب تک ملک میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کی تاریخ میں لکھنؤ کا نام نہیں لیا جاتا، حالانکہ شاہانِ اودھ کے زمانہ میں لکھنؤ میں بھی ایک دار الترجمہ قائم تھا، نئے علوم و فنون کی کتابیں یہاں ترجمہ ہو کر مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں، اس محکمہ کی طرف سے ۱۹ رسالے چھپ کر شائع ہوئے تھے، جن میں سے دس رسالوں کے نام نہیں معلوم ہیں، اور جن کی تفصیل میں نے معارف ۱۹۱۷ء میں کی ہے، یہ ہیئت، کیمیا، مناظر اور طبعیات اور اس کے اقسام قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا اور علم الحرارۃ وغیرہ سائنس کے مختلف علوم پر ہیں، لارڈ بروگہم (Brougham) کی کتاب A treatise on The objects Advantages and pleasures of Science کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانہ میں چھپا، اور بھوپال کے دفتر صیغۂ تاریخ میں میری نظر سے گذرا ہے،

لکھنؤ کی اس علمی و تعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا، اور اسکی ایک جنرل کمیٹی تھی، جو کتابوں کے ترجمہ و اشاعت کا کام کرتی تھی، اور رصد خانہ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجموں کی دیکھ بھال کرتا تھا، ایک انگریز نے اردو میں فن زراعت پر کتاب لکھی تھی،

ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا پتہ چلایا جائے، اور آئندہ دلی سوسائٹی، اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے، اسی عہد کی ایک کتاب اردو حساب میں ہوگا، تم ہے، جس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں ہے،

لکھنؤ کے ادبیات | لکھنؤ نے اسکے بعد زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، افسوس ہے کہ انکی کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں، بادشاہوں کے زمانہ میں داستان گوئی کا ایک مستقل فن تھا، اور بڑے بڑے بانداں اور زبان آور بادشاہوں، اور امیروں کے شبستانوں میں بیٹھکر اپنی دلچسپ داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلایا کرتے تھے، حکیم ضامن علی جلال کے والد بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے، اخیر زمانہ میں اس فن پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں، اسوقت کہانیوں کے کردگار، دیو پریاں، اور جادوگر اور طلسم ساز ہوتے تھے، داستانِ امیر حمزہ، نوشیروان نامہ، طلسم ہوش رُبا، ایرج نامہ وغیرہ مختلف ناموں سے ہزاروں صفحات میں خیالی ادب اور زور بیان کا ایک طلسم کھڑا کیا گیا، اس کتابی طلسم کا افتتاح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا شہر پیش نہیں کر سکتا، ان کتابوں کے مصنف جنکو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے، میر محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور طوطا رام شایان وغیرہ ہیں، یہ نظم و نثر کے ہزاروں صفحات حق یہ ہے، کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہیں، نثر میں سرور کا فسانۂ عجائب، اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویاں وہ جواہر پارے ہیں، جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں،

امانت کا اندر سبھا مدتوں تک اہلِ شوق کا تماشہ گاہ رہا ہے، اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے، کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا، بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا، اور اسکا تماشہ پردوں کیساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا، اور اس طرح اردو میں ان جدید تماشوں اور ناٹکوں کی تمدنی بدعت بھی یہیں پیدا ہوئی،

مین نے ہندوستانی ادب کی اس صنف کی یہ تمہیدی تاریخ اسلئے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ قدیم و جدید سے ملکر ہماری زبان میں ناولوں کی پیدایش کے لئے لکھنؤ ہی کی زمین کیوں موزوں ہوئی اور شرر و سرشار، مرزا رسوا، سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ اور جوالا پرشاد برق کی تخلیق کا باعث ہوئی، شرر نے قومی تاریخ اور اصلاحِ معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے رسم و رواج اور طور و طریق کو، اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص حلقہ کے خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر عہد انہی کے دم قدم سے پر رونق تھا، لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار، اور فسانہ آزاد، شرر کی فردوس بریں، اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادب اردو کی بہترین کتابین ہین،

مطبع | آجکل ادبیات کے سلسلہ تاریخ کی ایک کڑی مطبع بھی ہیں، لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے علاوہ مطبع محمدیہ (۱۲۵۵ھ بعہد محمد علی شاہ) محمد یعقوب، مطبع علوی علی بخش خان (۱۲۶۳ھ) مطبع مصطفائی محمد مصطفٰی خان (۱۲۷۱ھ) کانپور (۱۲۶۳ھ) مطبع محمدی حاجی محمد حسین لکھنوی (۱۲۶۲ھ) مطبع جعفریہ حکیم مرزا جعفر خان (۱۲۶۵ھ) مطبع امینی محمد عباس، مطبع صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبع تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطبع، مطبع سلطانی، سلطان المطابع کے قانوناً زیرِ نگرانی تھے، اور اسکے مہتمم کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول ثابت جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا، یہ نام اس عہد کی مطبوعہ کتابوں پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے،

مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجہ پر تھا، علما اور طلبہ اسکی چھپی ہوئی کتابوں کے قدردان تھے، اور اب بھی اسکی چھپی ہوئی کتابیں اہلِ شوق میں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی ہیں، سب سے آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے، جس کی زندگی اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے، اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور نولکشور پریس ہے، یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا،

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں انکا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا، ہماری زبان کی تمام ادبی اور علمی کتابیں اس مطبع سے چھپ کر نکلیں، شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، مرثیے، قصے افسانے داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں، تاہم غلط نویسی اور غفلت جو کثرت کا نتیجہ ہے اسکی شہرت کے چہرہ کا بدنما داغ ہے، شعرائے قدیم میر سودا، ناسخ، آتش، جرأت مصحفی، انشا، رند وزیر صبا، انیس دبیر، میر مونس، اسیر امیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے، اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے،

مطبع تیغ بہادر بھی صدی کے وسط میں ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ رہا،

اخبارات۔ زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اخبارات ہیں، ہمارا یہ شہر اس سلسلہ میں بھی پیچھے نہیں رہا، یہ نہیں معلوم کہ یہاں کا پہلا اردو اخبار کون ہے، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صوبہ میں اردو کا پہلا روزانہ اخبار اودھ اخبار یہیں نکلا اور جو آج تک نکل رہا ہے، اسکے آغاز کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، اور یہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے،

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقیہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا، سید سجاد حسین جنکی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے، اسکے اڈیٹر تھے، یہ وہ اخبار ہے جسکے صفحات میں منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین، نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طرز و طریق سے آگاہ تھے روشناس ہوئے،

سنجیدہ اخباروں میں مشیر قیصر (مرتبہ مولوی غلام محمد خان تپش ۱۸۸۳ء) اور آئینہ اور آزاد ہفتہ وار اخبار بھی گذشتہ صدی کے ادیبوں کی پیداوار میں معین ہوئے، آزاد آخر میں اودھ پنچ کا ضمیمہ ہو گیا تھا، میری

طالب علمی کا زمانہ تھا، سجاد حسین مرحوم بیکار ہو چکے تھے اسوقت اس آزاد کی چند ماہ تک کی اڈیٹری کا فرض چند دوستوں کیساتھ مل کر میں نے بھی ادا کیا تھا،

اردو کا سب سے پہلا آزاد سیاسی اخبار ہندوستانی نے بھی اسی شہر میں جنم لیا، گنگا پرشاد ورما اسکے اڈیٹر تھے، یہ اپنے زمانہ میں کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولانا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگریسی خیال کے تھے اسکو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے،!

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد سیاسی اخبار ہیں لیکن زمیندار کے بعد ۱۹۱۰ء میں اس ملک میں سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مسلم گزٹ بھی یہیں پیدا ہوا، جسکے اڈیٹر مرحوم وحید الدین سلیم اور اسکے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلی تھے،

رسالے۔ رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا، میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہاں کا سب سے پہلا ادبی رسالہ محشر ہے، جو مولوی عبد الحلیم شرر کا پہلا ادبی کارنامہ تھا، یہ ۱۸۸۲ء میں نکل کر دو سال کے بعد بند ہو گیا تھا، ۱۸۸۷ء میں شرر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا جو اپنے زمانہ میں جدید طرز تحریر کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بیشمار ادیب اور نثار پیدا کئے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوا،

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے، منشی نثار حسین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک زمانہ میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعرا امیر، داغ، جلیل، تسلیم وغیرہ اور انکے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں، یہ انیسویں کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا، جسکی باتوں کو سنکر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا، اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا،

اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے، جو حکیم محمد علی خان کی اڈیٹری میں ہردوئی سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریف سمجھنا چاہئے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے، اور اون کے قلم میں وقت کا سماں اور سینری دکھانے کا خاص ملکہ تھا،

(باقی)

شاہجہان کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

(۲)

فضلاء مندرجۂ ذیل فضلاء دربار شاہی سے منسلک تھے،

علامی سعد اللہ خان، شاہجہانی عہد میں علامی سعد اللہ خان کو اپنی علمی فضیلت اور سیاسی تدبر میں وہی درجہ حاصل تھا، جو علامی ابو الفضل کو دربار اکبری میں تھا، سعد اللہ خان کے تبحر علمی کے تمام معاصر مورخین معترف ہیں، عبد الحمید لاہوری سعد اللہ کا تعارف اس طرح کراتا ہی:-

"چوں گرامی توجہ کشور خدیو گیتی خدا باعتنا و فضلا نامدار وارتباط فصحا بلاغت دثار معروف است و بمسامع مقدس کہ ہموارہ شاہراہ بشایر باد رسید، کہ ملا سعد اللہ کہ موطن و منشاء او دار السلطنۃ لاہور است بجلیہ فضائل و کمالات عقلی و نقلی وحفظ قرآن مجید وحسن تقریر ولطف تحریر متحلی است، و در ذہن وقاد و فکر نقاد و کثرت معلومات و بسطت مدمات مشارک و مساہم ندارد، بموسوی خان صدر حکم شد کہ آن حاوی فضائل را بسعادت بساط بوس مستسعد گرداند، خان مذکور، روز یک شنبہ ہفدہم این ماہ (رمضان) اورا بایں دولت عظمی فائز گردانید، پادشاہ دوربیں ثواب گزیں از خطوط پیشانی او استعداد کارگزاری و کاردانی دریافتہ، درسلک زمرۂ بندگان منسلک گردانیدند"[1]

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۳۰

یہی بات عمل صالح جلد دوم میں اس طرح مذکور ہے:-

"..... در رمضان سنہ یکہزار و پنجاہ بصدارت وسفارش زبدہ سلسلہ حضرت خیر البشر موسوی خان صدر کل بدریافت، شرف حضور ماذون گشتہ، در مجلس اول از پرتو کمال قدر شناسی و مزاج دانی حضرت خلافت مرتبت استعدادش صورت نمود پذیرفت، و ببرکت تمیز اشرف و فطرت دقیقہ رس آنحضرت مقدار کمال آن بلند اقبال پدیدار گشتہ، دقت طبع وجودت فہم و کثرت فراست وحدس صائب واستنباط دقائق، و دریافت حقایق و تفصیل تحصیل ابواب دانش آن جامع فضائل وہبی وکسبی خاطر نشان اہل علم گشت، چون ہمگی ہمت بادشاہ ہنر پرور دانش نواز در ترویج شرع مبین وامداد وتقویت اکابر دین واشراف وتعظیم علما وصلحا، وتربیت طلبہ علوم وحسن اہتمام در پیش آوردن طائفہ مذکور معروف است ببرکت ہمزبانی خاص آنحضرت کہ ہم خاصیت آب زندگانی است حیات جاودانی یافتہ، بروز مانہ مناسب وخلعت واسپ سرفراز گردیدہ در زمرۂ بندگان منسلک گشت ......رفتہ رفتہ کاران جامع الکمالات از عنایت خاص آنحضرت بجائے کشید، کہ در سال دوم منصب جلیل القدر سہ ہزاری ودو ہزار سوار وخدمت خانسامانی سربلند گشتہ، در انجمن ہمدم وہمساز و در خلوت محرم وہمراز گشت، و در سال چہارم از فیض تربیت سحاب آن ابر گوہر بار سپہر قدرشناسی نہال اقبالش طوبیٰ مثال بالیدہ زینت افزائے بوستان، وزارت کل ہندوستان گشت، و در سال ہفتم بعنایت منصب ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار از انجملہ پنجہزار دو اسپہ سہ اسپہ و دو کرور دام انعام و خطاب علامی و فہامی دقایق مراتب کمالات از ارتفاع درجات آسمانی درگذرانید"[1]

افضل خان، شکر اللہ نام، افضل خان خطاب تھا، شیراز کا رہنے والا تھا، ابراہیم ہمدانی اور میر تقی الدین

[1] عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۳۶،

محمد سے تعلیم حاصل کر کے جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور شاہی ملازمت میں داخل ہوا، جب جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اودے پور کی مہم پر بھیجا، تو شکر اللہ ساتھ گیا، یہاں اس نے قابلِ قدر خدمت انجام دی، جہانگیر نے افضل خان کا خطاب دیا، شاہجہان جب سریر آرا ہوا، تو وہ اپنی لیاقت و قابلیت کے سبب وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوا، ہفت ہزاری و چار ہزار سوار کے منصب پر فائز تھا[1]،

ملا محمد فاضل بدخشان کے رہنے والے تھے، کابل، توران، اور شیراز سے علم معقول و منقول حاصل کر کے ہندوستان آئے، تفسیر اور اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے حاصل کی، اپنی لیاقت کے سبب عدالت اردوئے گیہان پر فائز تھے،

ملا یوسف لاہوری تفسیر اور منقولات کے ماہر تھے،

عبد السلام دیوی، معقول منقول، فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، شاہی فوج کیساتھ منسلک تھے،

قاضی محمد زاہد کابلی، کابل میں شاہی قضائت پر مامور تھے، یہ وہی ہیں جنکی تالیف میر زاہد رسالہ معقولات میں درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے،

قاضی محمد اسلم، ہرات میں پیدا ہوئے، بخارا میں علوم دینیہ حاصل کیا، جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے، ان کی دینداری و پرہیزگاری سے متاثر ہو کر جہانگیر نے شاہی لشکر کا قاضی بنایا، شاہجہان نے ان کو امام خاص بنایا،

قاضی محمد سعید کربرودی، کچھ دنوں تک دار الضرب کے داروغہ رہے، پھر "عرض مکرر" کی خدمت انجام دی، آخر میں بیوتات نوازش کے دیوان تھے، ہزاری منصب پر فائز تھے،

ملا میرک شیخ ہروی، ہرات سے ہندوستان آئے، پھر مکہ معظمہ گئے، وہاں حدیث کی تعلیم حاصل

[1] بادشاہنامہ جلد اول ص ۳۲۹،

کی ہندوستان آئے، تو شاہجہان نے داراشکوہ اور مراد بخش کی تعلیم کے لئے مقرر کیا،

ملا عبد اللطیف سلطانپوری، تقریر و تحریر اور علمی تحقیق و تدقیق میں یگانۂ روزگار تھے، داراشکوہ کی تعلیم کے لئے مقرر تھے، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، تو شاہجہان نے چند مکانات ان کو بطور انعام دیے اور اجازت دی کہ وطن جا کر علوم دینیہ کا درس دیں،

میر محمد ہاشم معقولات، منقولات، طب اور ریاضی کے عالم تھے، شاہجہان نے انکی لیاقت کو دیکھکر تمام ملک کی "صدارت" و طبابت کی خدمت پر مامور کیا، پھر اورنگزیب کی تعلیم انہی کے سپرد کی گئی، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھکر شاہجہان کے نام سے معنون کیا،

شیخ محمد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، وہاں سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، پرہیزگاری نیک کرداری اور دوسرے فضائل سے متصف تھے، شاہجہان نے انہیں دار السلطنت کا میر عدل مقرر کیا[1]،

ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مآثر الکرام میں انکا ذکر ان الفاظ میں ہے :-

"علامۂ زمان افتخار زمانیان است، الحق در جمیع فنون درسی مثل او از زمین ہند بر نخاست، آثار دانش بایں کیفیت و کمیت و حسن قبول بر صفحہ روزگار نداشت، مولد و منشا او سیالکوٹ از توابع لاہور است، ...... چون نوبت دارائے ہندوستان بہ صاحب قران شاہجہان انار اللہ برہانہ رسید، و طائفہ علماء و شعراء را رواجے دیگر پدید آمد، ملا درین عہد بارہا خود را بہ درگاہ خلافت رسانید، بر گاہ وار حضوری گردید، بہ رعایت نقود تا معدود مخصوص می گشت و دو بار بہ زر سنجیدہ شد، و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت و چند قریہ بہ رسم سیورغال انعام شد[2]، ملا بہ حضور خاطر و فراغ بال در وطن مالوف اقامت داشت، و تخم علم و فضل در سرزمین

[1] مذکورۂ بالا علماء کے حالات کے لئے دیکھو بادشاہنامہ جلد اول از عبد الحمید لاہوری ص ۳۴۶ - ۳۲۹، [2] مزید تائید کیلئے دیکھو بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۴۲،

سینہا و سفینہا می کاشت، تصانیف او در بلاد عرب و عجم سائر و دائر داشت"[۵۱]

شیخ عبدالحق دہلوی، ان کا ذکر خیر عبدالحمید لاہوری ان الفاظ میں کرتا ہے:

"مجمع فضائل صوری و معنویست، ...... او در فنون دانش یکصد دکسری از تصانیف مختصر و مطولہ دارد، باآنکہ عقود زندگیش بتسعین پیوستہ است از سلامت قوی بانواع طاعات و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصحیح بسان ایام شباب می پردازد و از اعقاب او ہفت تن تحصیل علوم رسمیہ نمودہ بافادہ مشغول اند......"[۵۲]

مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شیخ صاحب کا لگاؤ شاہجہانی دربار سے کیا تھا،

ملا فرید دہلوی، یمین الدولہ آصف خان کے حسنِ اہتمام سے ملا فرید دہلوی نے اور منجموں کی مدد سے ایک زیچ تیار کی جسکا نام زیچ شاہجہانی رکھا، شاہجہان کے سامنے جب یہ زیچ پیش کی گئی، تو اس نے عام استصواب کی خاطر ہندوستانی زبان میں ترجمہ کے لئے حکم دیا،[۵۳]

میر محمد صالح مشکیں قلم، میر عبداللہ زریں رقم کا لڑکا تھا، ایک کتاب مناقب مرتضوی لکھ کر شاہجہان کو گذرانی، شاہجہان نے چند اوراق دیکھے، تو بہت پسند کی، پانچ ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی انعام میں دیا،[۵۴]

ہندو اہل قلم **چندربھان** برہمن، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، پنجابی برہمن تھا، لاہور میں پیدا ہوا، ملا عبدالکریم سے تعلیم حاصل کی، آگے چل کر فارسی زبان کا باکمال شاعر ہوا، برہمن تخلص کرتا تھا، اس کا فارسی دیوان اب تک کتب خانوں میں موجود ہے، فارسی ادب میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی، اس لئے دربار شاہی کے سلک ملازمین میں داخل ہو کر وقائع نویس یعنی شاہی تاریخ و روزنامچہ

۵۱ تصانیف کی فہرست کے لئے دیکھو مآثر الکرام دفتر اول ص ۲۰۵، ۵۲ بادشاہنامہ جلد اول ص ۳۴۲، ۵۳ عمل صالح جلد اول ص ۳۶، ۵۴ خافی خان جلد اول ص ۲۰۵،

کا چیف اڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدۂ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر ہر روز کے مرتبہ واقعات و حالات سناتا تھا، ۱۰۵۵ھ میں اوس نے چہار چمن برہمن لکھ کر نوروز کے موقع پر سرہند میں دربار شاہجہانی سے گذرانی، آخر میں دارا شکوہ کا میر منشی ہوا،[۵۵]

شاہجہان، اکبر و جہانگیر کی طرح ہندو اہل کمال کی برابر سرپرستی کرتا رہا، ۱۰۶۱ھ میں ایک ہندی شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت کہی، تو اسکو دو ہزار روپے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا،[۵۶] ہندی شاعری میں سندر اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اسکی تصنیف "سندر سرنگار" اور "سنگھاسن بتیسی" برج بھاشا میں مشہور ہے، ہندی کے مشہور شعراء چنتامنی اور راجہ شمبھوناتھ سنگھ بھی اسکے دربار سے منسلک رہے، چنتامنی چھتا یعنی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھوناتھ نے شاہجہاں کی فرمائش سے کوندرا کلپ لتا لکھی، اس کتاب میں شاہجہان دارا شکوہ اور جہان آرا بیگم کی مدحیہ نظمیں ہیں،[۵۷]

ان ارباب علم کے علاوہ شاہجہاں کے عہد میں مندرجۂ ذیل علماء و شعراء بھی تھے، جن کا ذکر قزوینی کی شاہجہان نامہ میں ہے،

(۱) سید بخاری گجراتی، (۲) سید جلال الدین، (۳) شیخ میر لاہوری، (۴) خواجہ خوند محمود، (۵) شیخ بہلول قادری، (۶) مرزا ضیاء الدین، (۷) مولنا محب علی، (۸) شیخ نذیری (۹) ملا شکر اللہ شیرازی (۱۰) میر ابو القاسم ایرانی،[۵۸]

۵۵ دیکھو معارف جلد ۲ نمبر ۴ مضمون ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی، از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ، نیز مخزن الغرائب از سندیلوی، ۵۶ خافی خاں جلد اول ص ۷۰۶، ۵۷ کی ہسٹری آف ہندی لٹریچر، ۵۸ یہ نام نریندر ناتھ کی کتاب "پروموشن آف محمدن لرننگ" سے لئے گئے ہیں، قزوینی کی شاہجہان نامہ میری نظر سے نہیں گذری، اس لئے ان علماء و شعراء کے حالات اور اون کے شاہی دربار سے لگاؤ پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں،

مورخین، شاہانِ مغلیہ کو تاریخ سے خاص ذوق رہا ہے، اسلئے ہر حکمراں کے عہدِ حکومت میں تاریخ نویسی کا خاص محکمہ رہا، شاہجہاں نے اس ذوق کی تکمیل کے لئے متعدد اہلِ قلم کی خدمات حاصل کیں، چنانچہ اس کی فرمایش سے جو تاریخیں مرتب ہوئیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں،

۱- بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی،

۲- بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری،

۳- بادشاہ نامہ از محمد وارث،

۴- شاہجہان نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی،

محمد امین قزوینی، محمد امین ابن ابو الحسین قزوینی ایران سے آکر پانچویں سن جلوس میں شاہجہانی دربار میں منشی کے عہدہ پر مامور ہوا، شاہجہاں اپنے دربار کے موجودہ تاریخ نویسوں کی کارکردگی سے خوش نہیں تھا، وہ ایک لائق اہلِ قلم کی تلاش میں تھا، اتفاق سے قزوینی نے بندیلہ کی جنگ کے حالات قلمبند کئے، شاہجہاں اسکی لیاقت سے خوش ہوا، ۱۰۴۵ھ یعنی آٹھویں سن جلوس میں قزوینی سے فرمایش کی کہ وہ اسکی پیدایش سے موجودہ عہد تک کی ایک مفصل تاریخ لکھے، قزوینی نے ابتدائی دس سال کے احوال قلمبند کئے، دوسرے دس سال کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکا[۱]، عمل صالح میں ہے

"مرزا امینا در اصطلاحات زبان فارسی مہارت تمام دارد و قاعدہ فنِ انشا را بقانون می شناسد، شاہد سخنش از لباس تکلف مبرا است و صاحب طبع و ذہن مستقیم و فکر رسا، سابق خدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود، و بعد ازان بخدمت جمع وقائع می پرداخت، و در سے خوش ظاہر و خوش محاورہ بود"

عبد الحمید لاہوری، عبد الحمید کا مولد اور مسکن لاہور تھا، علامی ابو الفضل کا شاگرد تھا، اسلئے

۱؎ ایلیٹ جلد ۷ ص ۱، برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۲۵۹،

اسی کے طرزِ انشا میں لکھنے کی مہارت رکھتا تھا، لیکن زمانہ کی ناسا عدت سے ٹھٹہ[۱] میں آکر عزلت نشین ہوگیا تھا، اسکے ادب و انشا کی خبر شاہجہاں کو ملی، تو اس نے اسکو دربار میں طلب کیا، شاہجہاں چاہتا تھا کہ ابو الفضل کی اکبر نامہ کے طرز پر اسکی حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ عبد الحمید کو اسی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاریخ نویسی کے لئے مامور کیا، عبد الحمید خود لکھتا ہے:-

"وسیلہ بعضی از محرمان بساط تقرب بعرض اشرف اقدس رسید، کہ عبد الحمید لاہوری المولد والمنشا کہ دل رمیدہ را از اختلاط این و آن و خاطر شوریدہ را از ارتباط فلان و بہمان واپرداختہ در معمورہ پٹنہ بزاویہ تنہائی و بیغولہ بے نوائی در ساختہ است روش سخن پردازی و طراز انشا طرازی شیخ ابو الفضل نیک فرا گرفتہ، اگر نگارش معالی و مکارم ایں دولت والا و گذارش محامد و مآثر این سلطنت دست بالا بدو باز گذاشتہ آید، ہر آئینہ این تالیف منیف و این تصنیف شریف بنہجے کہ در خاطر دوربین صواب گزین مرکوز است نگاشتہ بود[۲]"

یہ تاریخ شاہجہاں کی بیس سال کی حکومت پر مشتمل ہے، عمل صالح کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہجہاں اسکی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اسکو روپے میں تلوا کر انعام عطا کیا[۳]،

محمد وارث، آخر میں کبرسنی اور ضعف کے سبب عبد الحمید اس فرض کو انجام نہیں دیسکتا تھا، اس کے شاگرد محمد وارث کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی، جس نے بقیہ دس سال کی تاریخ کو مکمل کیا، وارث لکھتا تھا اور علامی فہامی سعد اللہ خان دیکھتے تھے، پھر علاء الملک طونی المخاطب بہ فاضل خان

۱؎ ایلیٹ ٹھٹہ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہے، لیکن اورنٹیل لائبریری پٹنہ کے فاضل کیٹلاگر نے صاف طور سے بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹہ ہے، پٹنہ کتابت اور پڑھنے کی غلطی ہے، ملاحظہ ہو، کیٹلاگ جلد ۷ ص ۶، ۲؎ بادشاہنامہ جلد اول ص ۱، ۳؎ عمل صالح،

جو شاہجہانی عہد میں خانسامان کے عہدہ پر ممتاز تھا اور اورنگ زیب کے زمانہ میں وزیر ہوا، اس پر نظرثانی کیا کرتا تھا، آخر کا کچھ حصہ اس نے خود لکھا،[1]

مرزا جلالہ طباطبائی، اصفہان سے ہندوستان ۱۰۴۴ھ میں آیا، شاہجہان کے دربار کے مورخین میں داخل ہوا، پانچ برس کی تاریخ لکھنے پایا تھا، کہ دشمنوں نے اسکے خلاف سازش کی اور وہ اس خدمت سے محروم کر دیا گیا، شش فتح کانگڑہ اسی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے، اس میں شاہجہاں کی شاندار فتح کا حال لکھا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تحریر میں چھ قسم کا طرز اختیار کیا ہے،[2]

درسگاہیں

ان درسگاہوں کو جو اکبر و جہانگیر اور ان کے امرا نے قائم کیں، شاہجہان نے نہ صرف ان کو بجنسہ رہنے دیا، بلکہ انھیں فروغ دینے کی کوشش کی، ان کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے ہمسایہ اس نے ایک مدرسہ دار البقار نامی قائم کیا، جس میں طلبہ معقول و منقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے[3]

[1] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۱۲، [2] اس عہد کی اور بھی مشہور تاریخیں ہیں، مثلاً محمد صالح کی عمل صالح دو جلد اور محمد صادق خان کی شاہجہان نامہ مگر ان مورخوں کا بظاہر کوئی تعلق شاہی دربار سے نہیں معلوم ہوتا ہے اس لئے اس مضمون میں ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا، [3] آثار الصنادید از سید احمد خاں باب تیسرا صفحہ ۱۲،

رقعاتِ عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم و ادب، سیاست، اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۲۹۰ صفحات، طباعت، کتابت، کاغذ بالخصوص ٹائٹل، نہایت دلفریب، قیمت: عہ

"منیجر"

105

رامچندرجی کی کہانی

از

جناب سلطین احمد صاحب بدایون

اس مضمون کا مقصد اردو داں اصحاب کو مسٹر ملا دی وین کٹارتنام بی اے سابق وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج راج مہندری (دکن) کی ایک تصنیف سے متعارف کرنا ہے جس کا نام "رام مصر کا فرعون" ہے،

کتاب کے نام سے ظاہر ہے، کہ مصنف کا موضوعِ بحث ہندوستان کی وہ مشہور ہستی ہے جسکو والمیک اور تلسی داس نے حیاتِ دوام بخش دی ہے، رامائن اور مہابھارت ہند کے ادبِ قدیم کے دو زبردست شاہکار ہیں، بہت سے دماغ ان کے مطالعے سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، مگر وہ نقاد جو تاریخی تحقیق کے مقصد سے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہمیشہ مایوس رہتے ہیں نہ تو اب تک ان کا زمانۂ تصنیف معین کیا جا سکا ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ ان کے بیانات میں کہاں تک اصلیت موجود ہے، آنا ضرور محسوس ہوتا ہے، کہ دونوں کتابیں بعد آنے والوں کی تحریف سے محفوظ نہیں رہی ہیں،

مسٹر وین کٹارتنام نے ان کی تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے، اور غیر معمولی جسارت سے کام لیا ہے، رامچندرجی اور کرشن جی کی ذات اب انسانیت سے بالاتر سمجھی جاتی ہے، لاکھوں انسانوں کے قلوب اُن کو معبود یا معبود کا پرتو خیال کرتے ہیں، ایسی صورت میں اگر ان کو قدوسیت اور الوہیت

کے سر پر علوی سے اُتار کر اس دنیا کے بادشاہوں میں جگہ دی جائے، تو یہ خود ایک مجرمانہ جرأت ہوگی، مگر وین کٹا رتنام کی تصنیف تو اسی پر بس نہیں کرتی، بلکہ ان محبوب ہستیوں اور ان کے تمام متعلقین کو جن کی مدح و ثنا کرتے ہمارے شعراء اور بھگتوں کو صدیاں گذر گئی ہیں، ہم سے چھین کر مصر کو سونپ دیتی ہے، لیکن مورخ کا قلم جذبات کا احترام کیوں کرے،

کتاب زیر بحث رامائن کے افسانے کو ایک مصری فرعون کا قصہ بتاتی ہے، یہ نسبت حیرت خیز معلوم ہوتی ہے کہاں مصر اور کہاں ہندوستان کا یہ فصیل بند رمنہ، پھر تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بعد مکانی اور بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس نسبت کو سُن کر پہلے تو لبوں پر وہ تبسم پیدا ہوتا ہے، جو کسی مجذوب یا دیوانہ کی باتوں پر آیا کرتا ہے، لیکن مطالعہ کے بعد استہزا استعجاب سے بدل جاتا ہے،

مصری تعلق اسقدر حیرت انگیز نظر آنے کا سبب یہ ہے کہ ہم ابتدا سے ہندی تمدن کو ایک پردہ نشین عورت سمجھتے آئے ہیں، جس کا آنچل بھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھا تھا، مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں سے آخر تک بار بار یہ سبق دیا گیا ہے کہ شمال نے ہمالہ پہاڑ اور باقی تین طرف سمندر نے عہد قدیم میں اس خطۂ جنت نشان کو پڑوس کے تمام ملکوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا، لیکن حال کے محققین جو نظریے پیش کر رہے ہیں، ان کا تقاضا ہے، کہ جلد سے جلد اس عقیدۂ باطل سے توبہ کر لیجائے، چنانچہ مسٹر وین کٹا رتنام کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرنے سے پہلے مناسب ہوگا، کہ ہند اور مغرب کے ہمسایہ ملکوں کے میل جول کا کچھ اندازہ کر لیا جائے، تاکہ مصری عقائد اور روایات کا ہندوستان میں پایا جانا ہمیں حیرت میں نہ ڈالے،

ہندوستان کے پرانے رہنے والے وہ قبیلے تھے، جن سے جنوبی ہند اب تک بھرا ہوا ہے، یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں سے آکر یہاں آباد ہوئے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ

وہ کافی متمدن تھے، اور ہمسایہ قوموں سے ربط ضبط رکھتے تھے، ہندوستان کے مغرب میں تہذیب کے دو بڑے گہوارے تھے، نیل کی وادی مصر میں اور دجلہ کی وادی عراق میں مسیح علیہ السلام سے چار ہزار سال پہلے ان دریاؤں کے کناروں پر انسان متمدن زندگی بسر کر رہا تھا، بہت سے فنون وہ حاصل کر چکا تھا، اور اسکی حیرت انگیز یادگاریں آجتک باقی ہیں، لیکن ہندوستان میں دریاے سندھ کی وادی میں ڈراوڑ قوموں کی تہذیب بھی ان سے پیچھے نہ تھی، اور یہ غالبًا اس مسلسل تعلق کا نتیجہ تھا، جو ہندی ڈراوڑوں کو ہمسایہ قوموں کے ساتھ ہمیشہ رہا،

سندھ کی وادی میں جو مہریں زمین سے برآمد ہوئی ہیں، ان کے نقش و نگار علماے آثار کے نزدیک قدیم سمیری طرز سے مشابہ ہیں، جو عراق اور بابل کی قدیم ترین متمدن قوم تھے، سندھ سے ذرا پرے ہٹ کر سیستان میں مٹی کے برتن سمیری برتنوں سے ملتے ہوئے پائے گئے ہیں[1]، ڈراوڑ قوم میں مُردے دفن کرنے کی رسوم وہی تھیں، جو جزیرہ کریٹ یا شہر ٹرائے اور بابل میں رائج تھیں، دکن میں چنگل پٹ، مدورا، اور سلیم کے اضلاع میں جو مٹی کے تابوت نکلے ہیں، وہ شکل میں ان تابوتوں سے مشابہ ہیں، جو برہمن آباد اور موہنجو دارو (واقع سندھ) یا کھا، و (واقع عراق) اور دوسرے بابلی شہروں میں پائے گئے ہیں[2]،

ان کے علاوہ بابل کے کلدانی دور میں ہند اور بابل کے درمیان تجارتی تعلقات کا ثبوت بعض الفاظ سے ملتا ہے، جو ہند سے بابل پہنچے تھے، مثلًا "من" کا لفظ ایک وزن یا مقدار کے معنی میں بابل میں بھی مستعمل تھا، اسی طرح سندھو ایک کپڑے کو کہتے ہیں، جو غالبًا سندھ میں بنتا ہوگا[3]، ہندی اور بابلی میل جول نے دریاے سندھ کی وادی کو تہذیب کا وہ مولد بنا دیا تھا، جس کو ہندوستان میں بجا طور پر اولیت کا شرف دیا جاسکتا ہے، ڈاکٹر بھنڈارکر نے گذشتہ انڈین کلچرل

[1] مشرق قدیم مصنفہ ہوگرث، [2] ہند قدیم، بنرجی، [3] ویدی ہند، رگوزن، صفحہ ۳۰۵-۶،

کانفرنس کا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ "دریاے سندھ کی وادی ایک غیر آریہ تہذیب کا گہوارہ تھی، آریہ قوم نے اس تمدن سے جو کچھ سیکھا اس کا صحیح اندازہ اب تک نہیں کیا گیا ہے، یہ حقیقت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہو کہ آخر زمانے کے ہندو مذہب کو رگ وید کے قدیم مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں، برخلاف اس کے بعد کا ہندو مذہب اُس غیر آریہ مذہب سے بہت کچھ ہمرنگ ہے، جو سندھ کی وادی میں پہلے سے موجود تھا"

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے ڈراوڑ قومیں جہاز رانی سے واقف تھیں، اور جب آریہ بدیسیوں نے اُن کو ڈھکیل کر جنوبی ہند میں اتار دیا، تب تو ان کے بیرونی تعلقات اور بھی زیادہ وسیع ہو گئے، توریت میں مذکور ہے کہ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو تحائف نذر کئے، اُن میں بہت سی خوشبو کی چیزیں، سونا اور بیش قیمت جواہر تھے، ان تحائف کے جو نام عبرانی توریت میں تحریر ہیں وہ عبرانی الاصل نہیں، بلکہ جدید تحقیق کے مطابق ڈراوری الفاظ ہیں،[1]

اسی کیساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ابتداے تاریخ سے عربی قومیں تجارت اور جہاز رانی میں ممتاز رہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ نامور فنیشین یا فنیقی تھے، جو مسیح سے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے عروج حاصل کر چکے تھے،

فنیقیوں اور عربوں کی سیاحت اور تجارت آریہ اور سامی قوموں کے میل جول کا بہت بڑا ذریعہ تھی، بہت سے ہندی الفاظ عرب تاجروں کی وساطت سے نقل وطن کر کے عرب میں آباد ہو گئے زنجبیل، کافور، اور مشک وہ تین ہندوستانی الفاظ ہیں، جو عرب کی ٹکسالی زبان میں شامل ہو کر اتنے عربی نما ہو گئے تھے، کہ قرآن کریم میں بھی موجود ہیں،[2] فن ملاحی کی بہت سی اصطلاحات جو عربی جہاز رانوں میں رائج تھیں، ہندی الفاظ سے ماخوذ بتائی جاتی ہیں،[3]

[1] ویدک ہند، رگوزن، ص ۳۰۰ [2] عرب اور ہند کے تعلقات سید سلیمان ندوی، ص ۳ [3] ،،

جدید نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے، تو ہند اور مغربی ایشیا کے درمیان سب سے بڑا واسطۂ اتحاد خود آریہ قوم تھی، اب تک آریہ قوم کا ابتدائی وطن ہندوکش کے پرے کسی نامعلوم خطہ کو بتایا جاتا تھا، لیکن ایک عرصہ سے یہ نظریہ زیر بحث آرہا ہے، مسٹر بال گنگا دھر تلک کا خیال تھا، کہ آریہ وطن بحر شمالی کے ساحل پر کسی جگہ واقع تھا، مسٹر چٹرجی سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ کشمیر نے بعض جرمن مستشرقین کے اشارات سے امداد پا کر اس نظریہ کو پیش کیا، کہ آریہ قوم کا مولد "پانٹس" یعنی بحر اسود کے سواحل کو سمجھنا چاہئے، گذشتہ سال ڈاکٹر پران ناتھ (بنارس یونیورسٹی) نے ایک سلسلۂ مضامین اسی مبحث پر سپرد قلم فرمایا تھا، اور دکھایا تھا، کہ ایشیاے کوچک میں جہاں سامی النسل قومیں آباد تھیں، وہیں پہلو بہ پہلو آریہ قومیں بنتی بگڑتی رہیں، کلدانی، آشوری، کنعانی وغیرہ اگر سامی النسل تھیں تو حطی، مطانی، میدی وغیرہ آریہ، مصر ڈاکٹر صاحب کے بقول سامی اور آریہ دونوں قوموں کا جولانگاہ رہا، رگ وید میں ڈاکٹر صاحب کو بابل کی تاریخ کے اتنے حوالے ملتے ہیں، کہ وہ اس کتاب کو ہندی نہیں بلکہ سمیری کہنا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، اُن کے نزدیک ہندوستان میں آریہ ایشیاے کوچک سے آئے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے، کہ ان میں بہت سے نوآباد کار مصر سے تشریف لائے ہوں،[1]

اس سے بہت پہلے ڈاکٹر ہیول نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا، کہ ہندوستان کے اندر بعض آریہ آبادیاں ایشیاے کوچک سے آنے والوں نے بسائی تھیں، وہ کہتا ہے کہ گمان غالب یہ ہے کہ پنجاب میں جو آریہ آباد ہوئے، ان میں بہت سے سمندر کی راہ سے خلیج فارس اور دریاے سندھ کے کنارے کنارے آئے، دو ہزار قبل مسیح کے بعد مطانی آریوں نے (ایشیاے کوچک میں) ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی تھی، ...... جب یہ سلطنت آشوریوں اور حطیوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی تو مطانیوں کے لئے

[1] ماڈرن انڈیا ویکلی، جولائی اگست ستمبر ۱۹۳۵ء [2] ہسٹری آف آرین رول، ہیول ص ۵،

راہِ فرار بس یہی تھی کہ براہِ دریا خلیج فارس تک اور وہاں سے ہندوستان تک پہونچیں۔[1]

عجب نہیں کہ دکن میں آریہ قوم کا پہلا قدم سمندر ہی کے راستے سے پہنچا ہو، بے اصل قصص سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو دکن میں آریوں کا پہلا فاتحانہ داخلہ چندر گپت موریہ کے عہد میں ہوا، موریہ سلطنت اسوقت تمام شمالی ہندوستان پر پھیل چکی تھی، چنانچہ گجرات کی جانب سے آریہ سلطنت دکن کی طرف بڑھی، اور کانکن کا علاقہ جو مغربی ساحل کے برابر واقع ہے، سب سے پہلے فتح ہوا، حالانکہ جغرافی اعتبار سے یہ وہ حصہ تھا جو موریہ دار السلطنت سے بعید تر ہونے کے علاوہ پہاڑوں اور دریاؤں کے سبب گجرات سے بالکل منقطع تھا، قدرتی طور پر موریہ سلطنت کو دکن کی طرف پھیلنے کے لئے جو راستہ اختیار کرنا چاہیئے تھا، وہ مگدہ یا جنوبی بہار کے متصل علاقوں یعنی تلنگانہ اور گونڈوانہ سے گذر کر آگے بڑھتا، یہ الجھن اس نظریہ کی روشنی میں صاف ہو جاتی ہے کہ مغربی ساحل پر آریہ قوم کی آبادی آریہ سلطنت کے پہونچنے سے پہلے موجود تھی، اور اس خطہ کی جائے وقوع اس امر کی شاہد معلوم ہوتی ہے، کہ اس کے آریہ باشندے سمندر کے راستے سے آکر وہاں آباد ہوئے تھے،

دکن کی ساری سرزمین میں یہی کانکن کا علاقہ جو مرہٹوں کا آبائی وطن ہے، آریہ تمدن اور آریہ نسل سے آباد ہے، جنوبی ہند کی تمام زبانوں میں صرف مرہٹی زبان کو آریہ خاندان میں شمار کیا جاتا ہے، اور بقیہ تمام دراوری زبانیں بتائی جاتی ہیں، اس کے علاوہ تمام دکن میں دراوری تہذیب کا اثر غالب نظر آتا ہے، اور ان میں صرف مرہٹہ مرقوم مستثنیٰ ہے، بہ الفاظ دیگر اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف کانکن ہی وہ حصہ تھا، جہاں آریہ آباد ہوئے تھے، بقیہ دکن پر انکا تصرف فاتحانہ حیثیت سے قائم ہوا،

مختصر یہ ہے کہ ان انکشافات کی روشنی میں جو آریہ قوم کا ابتدائی وطن ایشیائے کوچک

---

[1] ہسٹری آف آرین رول ہیول ص۵،

میں قائم کرتے ہیں، آریہ اور سامی تہذیب کا میل جول اور عقائد و روایات کا لین دین قرین قیاس ہو جاتا ہے، ان دونوں قوموں کی روایات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے تو محنت بار آور ثابت ہونے کی امید ہے، کیونکہ یہ ابتدائی ربط بعد کو بھی تازہ ہوتا رہا، وادی سندھ اور پنجاب کے علاقے تو بالخصوص مغرب کے ہمسایہ ممالک سے ہمیشہ پیوستہ رہے، اور غالباً اس تعلق کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ آشوریوں نے امداد کی،

آشوری سب سے پہلی قوم تھی، جس نے ایک وسیع سلطنت کی بنا ڈال کر مختلف ممالک اور مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع دیا، نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوری سلاطین کے لشکر میڈیا اور پارس پر حملہ کرتے تھے، شمالی شام سے گذر کر جنوبی شام تک پہنچ گئے تھے، دمشق اور فنیقیوں کی سلطنت ان کی باجگذار تھی، تگلات فلا زار ثانی کے تخت نشین ہونے پر (۷۴۵ ق م) ایک نئی روح پیدا ہو گئی،

نئے نئے ممالک فتح ہوئے، مصر تک زیر نگین آگیا، مشرق میں آشوری سلطنت کے ڈانڈے انڈس سے مل گئے، اور یونان بھی مفتوحہ ممالک میں شمار ہونے لگا،[1]

اُس دور میں کہ وسائلِ آمد و رفت مفقود تھے، بیرونی صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار ماتحت والیانِ ملک کی وفاداری پر منحصر تھا، چنانچہ ماتحت صوبوں اور مرکزی حکومت کے درمیان رابطۂ اتحاد مضبوط رکھنے اور تمدن و معاشرت کے اختلافات مٹانے کے لئے آشوریوں نے غالباً فراعنۂ مصر کی تقلید میں یہ دستور قائم کر لیا تھا، کہ مفتوحہ علاقہ کے سر بر آوردہ لوگوں کو آشوریہ میں اور آشوریہ کے باشندوں کو نو تسخیر ممالک میں آباد کر دیتے تھے،[2] اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ آشوری تہذیب ہمسایہ تہذیبوں میں گھل مل گئی ہوگی، چنانچہ یکسانی رسم الخط جو بابل اور آشوریہ میں

---

[1] تاریخ عہد قدیم، راولنسن ص۲۵۰-۲۰، [2] یونیورسل ہسٹری ص۵۹۹،

شروع ہوا تھا، تمام مغربی ایشیا میں عام ہوگیا، فراعنۂ مصر کے صوبہ دار شام سے جو مراسلے لکھتے تھے، وہ اسی رسم الخط میں ہوتے تھے،

آشوریوں کے بعد جب ایران پر میدیوں کی طاقتور سلطنت قائم ہوئی، ان میں کیخسرو سب سے زیادہ مشہور ہوا، جس نے نینوا کو فتح کرکے سلطنت کے حدود ایشیائے کوچک تک پھیلا دیئے، میدیوں ہی کے عہد میں بابل کی قدیم سلطنت نے دوبارہ عروج حاصل کیا، یہاں تک کہ اُس کی حد شام و فلسطین تک پہنچ گئی، بابلی سلطان نے مصر کے فرعون نیکوہ نامی کو خود اسی کے ملک میں پہنچ کر شکست دی، بنوکد نصر یا بخت نصر اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور سلطان تھا، (تاریخ انتقال ۵۶۲) اس کے عہد میں شام، فلسطین، فنیقیا اور مصر فتح ہوگئے تھے،

اُدھر میدیوں کے چند روزہ عروج کو پارسیوں نے ختم کر دیا، دارائے اوّل کے عہد میں پارسی سلطنت مغربی ایشیا کی سرتاج حکومت تھی، اس کی قبر پر جو کتبہ موجود ہے، اُس میں سلطنت کے صوبوں کے نام درج ہیں، جن میں ایک طرف مصر اور یروشلم شامل ہیں، تو دوسری طرف پنجاب[1]، اسوقت دارا تمام دنیا کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے فرستادے شاہی حکمنامے لئے ہوئے سندھ سے درۂ دانیال تک اور مصر سے لیکر وسط ایشیا تک سفر کرتے نظر آتے تھے[2]،

پارسیوں کے ہی عہد میں ایران اور یونان کے باہم خونریزی کا وہ طویل سلسلہ شروع ہوا، جس کا آخری نتیجہ سکندر کی فتوحات تھیں، مقدونیہ سے نکل کر سکندر نے ایشیائے کوچک، مصر، عراق، ایران، افغانستان، ترکستان اور پنجاب غرض کل مغربی ایشیا کو ایک سلطنت میں شیرازہ بند کر دیا، مگر یہ اتحاد عارضی ثابت ہوا، تاہم سکندر کے بعد ہندوستان کی سرحد پر باختر کی یونانی حکومت قائم ہوگئی، جس نے پھر ایک بار پنجاب پر قبضہ کرکے غالباً متھرا تک اپنے حدود وسیع کر دیئے، اُدھر وادیٔ سندھ میں

[1] گوزن صفحہ ۱۰، [2] تاریخ عالم، ایچ جی ویلز، صفحہ۔

دارائے اعظم کے صوبہ دار جو اب خود مختار حاکم تھے، اب بھی کہیں کہیں حکومت کر رہے تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور گجرات کا حاکم رُدرَمن تھا جس کا کتبہ گرنار (واقع ریاست جوناگڈھ) کی مشہور چٹان پر کندہ ہے،

غرض ولادتِ مسیح تک کوئی عہد ایسا نظر نہیں آتا، کہ ہندوستان کو مغربی ہمسایوں سے واسطہ نہ رہا ہو، اگر ایک طرف وادیٔ فرات کی قومیں سواحل نیل کے لوگوں سے ملتی رہتی تھیں، تو دوسری طرف بابل، آشوریہ، میدیا اور پارس کی سلطنتیں کبھی ہندوستان کی سرحد اور کبھی اندرون ملک تک پھیلی رہیں، ان حالات میں قدرتی بات تھی، کہ بہت سی مصری اور بابلی روایات ہندوستان آگئی ہوں، آج یقین کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس مسلسل تعلق کے سبب کون کون سے علوم و فنون عقائد و مراسم مغرب سے آکر ہمارے تمدن میں جذب ہوگئے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس طویل ربط کے باوجود بھارت دیس کی تہذیب اچھوتی نہ رہ سکتی تھی،

مصر اور بابل کے سامی تمدن کا ہندی تمدن سے اگر مقابلہ کیا جائے، تو بہت سے مشترک عقائد اور مراسم سامنے آجاتے ہیں، قدیم رگ ویدی ہندو تمدن، اور متاخر ہندو تہذیب میں جو بعد اور منافات ہے، اس کا سبب یہی بیرونی اثرات نہ ہوں، ممکن ہے کہ ہندوستان میں آریہ قوم کا ورود دو مختلف زمانوں میں اور دو مختلف مرکزوں سے ہوا، یا قدیم آریہ تہذیب کو دراوی میل جول نے کچھ سے کچھ کر دیا، تناسخ، ذات پات کی تفریق، برہمنوں کی غیر معمولی برتری، گائے کی پرستش، بتوں کی پوجا، مندروں کی تعمیر، ستی کا رواج، پردے کا دستور، قشقہ اور چوٹی وہ چیزیں ہیں، جن سے رگ ویدی معاشرت خالی معلوم ہوتی ہے، اور جو متاخر ہندو سماج کے لوازم ہیں، قیاس چاہتا ہے کہ یہ رسوم اور عقائد بابل، آشوریہ یا مصر سے ہم تک پہنچے ہوں گے، کیونکہ یہ ہمسایہ تمدن ہندو معاشرت سے اُسی قدر قریب نظر آتے ہیں، جتنا کہ رگ ویدی عہد بعید معلوم ہوتا ہے،

آشوری کلدانی زندگی کی ایک مختصر سی تصویر ملاحظہ ہو، جو سَین وِس کی کتاب "تاریخ ملل قدیمہ"

سے ماخوذ ہے، اور جو ہند و رسوم کا عکس نظر آتی ہے،

یہان کے امرا، باز و بند، گلو بند اور گوشوارے استعمال کرتے تھے، اُن کے بال بڑے بڑے اور گھونگر والے ہوتے تھے، عام لوگ ننگے پاؤں رہتے، بادشاہ اور امرا کئی کئی بیویان کرتے تھے، اور اُن کو گھرون میں قیدیون کی طرح رکھتے تھے، دیوتاؤن اور دیویوں کی مورتیان پتھر یا سونے چاندی کی بنا کر قیمتی لباس پہناتے، اور عمدہ مکانوں میں بہت حفاظت کیساتھ رکھتے، تیوہار کے دن اُن کو باہر نکالتے، اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ گشت دے کر پھر رکھدیتے، دیوتاؤں کی پوجا میں بخور جلاتے اور جانور قربان کرتے تھے، وہ خیال کرتے تھے، کہ ستارے خداوندوں کے بھید ظاہر کر دیتے ہیں، لہذا اُن کی حرکت کا کھوج لگاتے، اور اُن سے آیندہ واقعات معلوم کرتے، اُنکے کاہن پہلے سے ہوا، پانی، طوفان، سخت گرمی، اور اچھی بُری پیداوار کی خبر دیدیتے تھے، کلدانیوں کا خیال تھا، کہ بچے کی پیدائش کے وقت ستارے کے موقعے اور محل کو دیکھکر اُس بچہ کے آیندہ واقعات زندگی معلوم ہو سکتے ہیں، اور ہر آدمی کے لئے ایک خاص ستارہ ہوتا ہے، جس کے اثر میں اسکی زندگی بسر ہوتی ہے، تمام حوادث خصوصًا امراض کو شیاطین سے منسوب کرتے تھے، اس کے لئے بہت سے عمل کرتے تھے، سحر و طلسم کے بہت سے منتر اُن کے ہان رائج تھے، اُن کا خیال تھا، کہ بعض الفاظ میں ایک خاص اثر ہے، جس سے شیطان بھاگ جاتے ہیں،

مذکورۂ بالا بیان کے تمام اجزا آج بھی ہند و معاشرت میں جھلکتے نظر آتے ہیں، اس عام یکرنگی کے علاوہ ہندو دیومالا کے بہت سے نام اور بہت سے قصّے مغربی ایشیا کی روایات اور اصنام سے کچھ اسقدر مشابہ ہیں، کہ ان ممالک کا باہمی تعلق پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے، چنانچہ ان مشترک قصص اور ناموں کے علاوہ جنکو رگ وید سے انتخاب کرکے ڈاکٹر پران ناتھ نے پیش کیا ہے، ہندو ادب مین اور بھی مثالیں نظر آتی ہیں، مثلاً ایشور یا ایشر کا لفظ اور جسم و صورت سے بالاتر الوہیت کا وہ مفہوم جس پر یہ لفظ دلالت

کرتا ہے، دونون عجب نہیں کہ آشوری قوم کا عطیہ ہون، آشوری مذہب بہت سے دیوتاؤں کے علاوہ سب بالاتر ایک خدا کو سمجھتے تھے، اور ان کے تخیل میں یہ کوئی مبہم اور موہوم وجود نہ تھا، بلکہ ایک شخص ذات تھی، جس کا نام "ایس شر" تھا[۱]، ریگوزن کے بقول رگ وید میں ایشور کا لقب بطور ایک اہم صفت کے آریوں کے سب سے بڑے دیوتا دیائیں کے ساتھ مختص تھا، اور اسی مصنف کا خیال ہے کہ یہی لفظ ایران میں اہرمزد کی شکل میں تبدیل ہو گیا، جسکو زرتشت نے خداے قدوس کے لئے استعمال کیا، بعد میں اس کا اطلاق خوفناک اور مضرت رساں شیاطین پر ہونے لگا[۲]، جو لوگ ویدوں کے منتروں سے تاریخی واقعات نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے نزدیک آشور دیوزاد نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے دراوری باشندوں کا کوئی قبیلہ تھا، دشمن کو بُرے ناموں اور بُرے اوصاف سے یاد کرنا ہر قوم کا رواج رہا ہے، اسی جذبہ کی پیروی میں آریوں نے آشوروں کو شیاطین بنا دیا، بتایا جاتا ہے کہ چھوٹا ناگپور میں آج بھی ایک دراوری قبیلہ آشوری کہلاتا ہے[۳]،

لیکن اس تفسیر کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ رگ وید میں سب سے بڑے خدا کے لئے اس لفظ کا استعمال کیوں ہوا؛ اور دوسرے یہ کہ آج کے روزمرہ میں ایشور سے مراد خداے قدوس کیون ہونے لگا،

اتھروید میں جو اس مقدس سلسلے کی سب سے آخری کڑی ہے، یہ لفظ پھر اعلی اور اسفل دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے[۴]، اس کے یہ معنی ہوئے کہ ابتداءً اس لفظ کا اطلاق ایک عالی اور برتر خدا پر ہوتا تھا اور آخر زمانہ میں شیاطین کے لئے استعمال ہونے لگا، مفہوم کا یہ انقلاب صرف اس مفروضہ کے تحت، قابل فہم ہو سکتا ہے کہ آریہ اور آشوری قومیں کبھی علاقہ ہمسایگی رکھتی تھیں، چنانچہ آریہ بھی آشوری

[۱] نیو لارنڈ ہسٹری ص ۵۵، [۲] ویدی ہند ص ۱۳۷، [۳] تاریخ ہند قدیم بنرجی ص ۲۰-۲۱، [۴] اتھروید مصنفہ گرفتھ کتاب ۱۵ منتر ۹۵ اور کتاب ۱۰ منتر ۱ شیاطین کے لئے زیادہ کثرت کیساتھ مستعمل ہے کتاب ۸ منتر ۳ و منتر ۹ وغیرہ

خدا کا نام استعمال کرنے لگے، لیکن جب آشوری سلاطین کی جوع الارض نے ہمسایوں کو جابر حاکم اور ظالم فرمانروا بنادیا، اور آریوں کو اُن سے تنگ آکر نقل وطن کرنا پڑا، تو آریہ زبان میں آشور کا لفظ خبیث اور خوفناک قوتوں کا مترادف بھی بن گیا، اور اسی طرح یہ ذومعنویت ظہور میں آئی، چنانچہ ہیول کہتا ہے کہ ویدوں میں اسُروں اور دیوتاؤں کی جنگ کا ذکر غالباً اس مخاصمت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اقوام جنت آریون اور سامی النسل آشوریوں میں جاری رہی[1]،

نسلِ انسانی کا ایک فرد سے شروع ہونا بھی ہندو دیو مالا اور سامی روایات کی مشترک روایت ہے، ہندو ونیات میں دنیا کا پہلا آدمی منو ہے، یہ ایک لفظ ہے جس کے خاندان سے انگریزی (Man) فارسی مَن، جرمن (...) مصری منا اردو مانس سندھی مانڑو وغیرہ پیدا ہوئے سنسکرت لغت میں ہندو دیو مالا کے بقول نسلِ انسانی سات بار ہلاک ہوچکی ہے، اور ہر بار ایک منو پیدا ہوا ہے، جس سے نسل دوبارہ شروع ہوتی ہے، آخری منو ساتواں مورث انسانی تھا، اور اس کا باپ وِوس وتھ دیوتا تھا، منو کا ایک بھائی بھی تھا، جس کا نام یم تھا، یم کو بھی بعض نے غلطی سے پہلا انسان کہا ہے، لیکن ریگوزن کے بقول یہ عزت منو ہی کا حق ہے، کیونکہ رگ وغیرہ کے تمام منتر جن میں یم کا ذکر آتا ہے، اسکو پہلا مرنے والا انسان بتاتے ہیں، نہ کہ پہلا پیدا ہونے والا[2]، اسی خصوصیت کے باعث مردوں کی دنیا کا بادشاہ یم ہی کو مانا گیا ہے، یم کی بیوی یمی ہیں، اور منو کی بیوی ایدا، یم اور یمی توام بھائی بہن ہیں، منو کی بیوی ایدا اس طرح پیدا ہوئی ہیں کہ منو تنہائی سے گھبرا کر بہت سی دعائیں مانگتے ہیں، اور یہ دعائیں ایدا کی شکل اختیار کرکے ان کے سامنے آجاتی ہیں،

اس روایت میں سامی عقائد صاف نظر آتے ہیں، آدم علیہ السلام کے پہلو سے حوا پیدا ہوتی ہیں، منو کی دعائیں ایدا بن جاتی ہیں، آدم اور منو تو باہم مترادف ہیں ہی، ایدا کا الف جو

[1] آرین رول ص۲ . [2] ریگوزن ص۱۰۱

[1] آرین رول ص ۴

تانیث کی علامت ہوسکتی ہے، اگر ساقط کردیا جائے تو اید رہ جاتا ہے، اور اماں حوا کے انجیلی نام ایو (EVE) سے اس قدر قریب ہوجاتا ہے، کہ دونوں ایک ہی لفظ معلوم ہوتے ہیں، دوسری قدر مشترک یہ ہے کہ سامی روایت میں بھی پہلا پیدا ہونے والا، پہلا مرنے والا انسان نہ تھا، آدم پہلے پیدا ہوئے، تو ہابیل سب سے پہلے مرے، جیسا کہ توریت کے باب پیدائش میں مذکور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں یم اور منو بھائی بھائی ہیں، اور وہاں آدم اور ہابیل باپ بیٹے، آدم علیہ السلام کی اولاد میں بھائی بہن کے ازدواجی تعلقات بھی یم اور یمی کی شادی سے تائید پاتے ہیں،

ہندی روایت کے بہت سے اجزا غیر مربوط ہیں، مثلاً یم اور منو دونوں وِیوَسْ وتھ خدا کے بیٹے ہونے کے باوجود، ابوالبشر ہونے کی عزت صرف منو ہی کا حق کیوں سمجھی گئی، دوسرے یمی کو بھی خدائی فرزندیت کا شرف حاصل ہے، کیونکہ یم اور یمی توام ہیں، لیکن ہندی شعرائنے اس قصہ کو اور بھی زیادہ غیر مربوط نوح علیہ السلام کا واقعہ شامل کرکے بنادیا، انھوں نے نوح کو بھی منو ہی کا نام دیا، مگر ناموں کے خلط ملط ہونے سے اس بحث پر کچھ اثر نہیں پڑتا، کہ ابتدائے آفرینش سے سامی روایات آریہ قوم تک پہنچتی رہیں، چنانچہ نوح علیہ السلام کا واقعہ جو رگ وید کے علاوہ متعدد قدیم کتابوں میں مذکور ہے، اور جس کو تمام محققین سامی قوموں کا عطیہ تسلیم کرتے ہیں، اس امر کی سب سے بڑی شہادت ہے اور اسکی تکرار بے محل نہ ہوگی،

سنسکرت کی قدیم ترین روایت کہتی ہے، کہ صبح کے وقت وہ منو کے پاس بدن دھونے کے لئے پانی لائے، وہ دھو رہا تھا کہ ایک مچھلی ہاتھ میں آگئی، مچھلی نے منو سے کہا کہ مجھے پال لے، میں تجھے ایک طوفان سے بچالوں گی، جو آنے والا ہے، چنانچہ منو نے مچھلی کو پال لیا، مگر اس کا جسم اتنا بڑھتا گیا کہ گھڑے سے نکال کر تالاب اور تالاب سے نکال کر دریا یا سمندر میں چھوڑ دینا پڑا، جس سال مچھلی نے بتایا تھا طوفان آیا، مچھلی ہدایت کرچکی تھی کہ کشتی پہلے سے تیار کرلینا، چنانچہ منو نے کشتی بنا رکھی تھی،

جب طوفان آیا تو منو جی تمام جانداروں کا ایک ایک جوڑا لے کر اس میں بیٹھ گئے، اب وہ مچھلی نمودار ہوئی، اور کہنے لگی کہ کشتی کو میرے سینگ سے باندھ دے، ایسا ہی کیا گیا، آخر کشتی شمال کی طرف دُور ایک پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔[۱]

بُت پرستی مندروں کی تعمیر، برہمن کا تفوق، یہ سب وہ چیزیں ہیں، جن سے رگ ویدی تمدن کو بہت کم لگاؤ تھا، مگر بابل اور اسیریا دونوں جگہ یہ دستور موجود تھے، آشوریہ میں تو برہمن جماعت اتنی بااثر تھی کہ آشوری سلاطین کو قدیم دارالسلطنت جہاں پروہتوں کا زور تھا، چھوڑ کر نینوا کو منتقل ہونا پڑا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رگ ویدی عہد میں نہ بُت تھے نہ مندر، اور ریگوزن کا خیال ہے، کہ آریہ قوم نے یہ چیزیں باہر کو حاصل کیں،[۲] لیکن بیرونی اثرات صرف بابل اور آشوریہ سے منتقل ہو سکتے تھے کیونکہ ہندوستان کا قریب تر ہمسایہ زرتشتی تمدن معابد اور اصنام سے ہمیشہ بے نیاز رہا،[۳]

اسی سلسلہ میں ہندوستان کے قدیم رسم الخط کو بھی آریہ اور سامی داد و ستد کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے، رسم الخط کو مغربی ایشیا اور ہندوستان کے درمیان قوی ترین واسطۂ اتحاد تصور کرنا چاہئے، ہندوستان کے قدیم ترین کتبے برہمی اور خوراشتی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں، اور یہ دونوں ابتداً سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف لکھے جاتے تھے، جو سامی تحریر کی مستقل خصوصیت ہے، آخر زمانہ میں برہمی خط کی روش تو بدل گئی، لیکن خوراشتی رسم الخط کی یہ شان آخر تک قائم رہی، محققین کے نزدیک یہ دونوں رسم الخط فنیقی اور آرامی تحریر سے ماخوذ ہیں،[۴] یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ رسم الخط کے ساتھ خدا معلوم کتنی رسوم اور روایات ہندوستان وارد ہوئی ہوں گی، ہندوستان میں تحریری آثار تین سو قبل مسیح سے پہلے کے موجود نہیں، اسی عہد سے کچھ قبل یہ رسم الخط اور اس کی ذیلی روایات ہندوستان منتقل ہوئی ہوں گی،

[۱] ویدی ہند صفحہ ۲۲۶، [۲] ۔ صفحہ ۱۳۳، [۳] نیو لانڈ مسٹری ۲۲۳، [۴] ہند قدیم مصنفہ بیپن

بابل اور آشوریہ سے گذر کر فنیقی اور مصری روایات کو بھی ہندوستان پہنچنے کے مواقع کثرت حاصل تھے، ہندوستان اور مصر کے درمیان مواصلت کے سلسلے بحری راستہ سے قائم تھے، اسکے علاوہ مصر اور بابل کے باہم مبادلہ مسلسل ہوتا رہا، اور مصری عقائد اور روایات کا براہ بابل ہندوستان پہنچنا بھی ممکن تھا، چنانچہ مصری تہذیب کے بہت سے عناصر بھی ہندوستان میں جھلکتے نظر آتے تھے، مثال کے طور پر انسان کے جسم میں خدا کا ظاہر ہونا، جیسا کہ رامچندر جی اور کرشن جی کی نسبت عقیدہ ہے، مصری تخیل معلوم ہوتا ہے، مصری فراعنہ خود کو "آمن رَع" دیوتا کا اوتار کہتے تھے، اسی خیال کا اعادہ مغربی ممالک میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت میں ہوا، قدیم مصری خداوندوں میں آسیرس کو مخصوص اہمیت حاصل تھی، مسٹر ویلز لکھتے ہیں، "آسیرس کے متعلق عقیدہ تھا کہ وہ بار بار مرتا اور بار بار زندہ ہوتا تھا، وہ صرف تخم ریزی اور نباتات ہی کا دیوتا نہ تھا، بلکہ تصور کو ذرا وسعت دیجئے، تو بقاے دوام کا مظہر تھا، اس کا نشان ایک جوڑے پروں والا کیڑا تھا، جو اپنے انڈے دفن کر دیتا ہے مگر اس کے اس عمل کا مقصود جو بہ ظاہر ایک مہلک فعل ہے، یہ ہوتا ہے کہ زندگی دوبارہ وجود میں آئے چمکتا ہوا آفتاب بھی آسیرس کا نشان تھا، کیونکہ وہ غروب ہی اسی لئے ہوتا ہے کہ پھر برآمد ہو، آخر زمانہ میں اس دیوتا کا نام اِے پِس تھا، آسیرس سے وابستہ ایک دیوی آسنر نامی تھی، جس کا دوسرا نام ہوتر یا گائے کی دیوی تھا، ہلال اور چمکتا ہوا تارا اُس کا نشان تھا، ہوتر کی تصویر ایک ہلال پہ کھڑی ہوئی اور ایک شیر خوار بچہ گود میں لئے ہوئے ہے، یہ بچہ ہورس یا صبح کا دیوتا ہے، ان تین خداؤں کے نیچے اور بہت سے عجیب قسم کے دیوتا تھے"،

اس اقتباس میں چاند سورج اور گائے بیل کی زوجیت کا وہ تخیل موجود ہے، جس کی مثالیں کثرت کیساتھ ہندو قصص میں پائی جاتی ہیں، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ دیوتاؤں کی شادیاں کرونے اور ان سے اولاد کا سلسلہ قائم کرانے میں یونانی قوم بھی ان سے پیچھے نہیں رہی، ہر البتہ وہ خداوندی

تثلیث جو مصر اور بابل میں پائی جاتی تھی، وشنو شیو اور برہما کے مثلث اتحاد سے ہمرنگ معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مسٹر ونیکٹار تنام مصری آسریس کو ہندی شیو کا پیشرو بتاتے ہیں،

لیکن سب سے زیادہ نمایاں اشتراک گائے کی تقدیس اور حرمت ہے، جو موجودہ زمانہ میں بجز ہندوستان کے اور کہیں باقی نہیں، بنی اسرائیل کا گوسالہ پوجا، اور بابل کے قدیم آثار میں پردار گائیں ملنا، جنکو بیماری پیدا کرنے والے شیاطین کا دخل روکنے کے دروازوں پر نصب کیا جاتا تھا، ظاہر کرتا ہے کہ گاؤ پرستی مصر اور بابل کے مذہب کا اہم جزو رہی تھی، اور بہت ممکن ہے، کہ ہندوستان نے یہ سبق وہیں سے سیکھا ہو، گائے کے علاوہ گھڑیال، بگلہ، اور بندر بھی مصر کے مقدس جانور تھے، نیل کا وہی احترام کیا جاتا تھا، جو گنگا، کو ہمارے دیس میں حاصل ہے، بخور اور ناقوس پوجا کے وقت استعمال ہوتے تھے، اور ایک برہمن طبقہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی موجود تھا، رالنسن کہتا ہے، :۔

ایک جماعت دوسری جماعت سے اس قدر نمایاں طور پر جدا تھی، اور موروثی پیشہ اختیار کرنے کا رواج اس درجہ عام تھا، کہ مصری معاشرت کا نظام ہندوستان کی سماج سے بہت زیادہ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے،

اور سنوسیں بتاتا ہے کہ

"کاہنوں کے لئے معبد ہی میں مکان بنے ہوتے تھے، اُن کا کام تھا، کہ عبادت اور ریاضت میں عمر بسر کریں، ہر ایک کو رات دن میں دو دو مرتبہ غسل کرنا ضروری تھا، بدن کے تمام بال حتی کہ ابرو تک، روزانہ ترشواتے تھے، بکری سُور مچھلی اور لوبیا کھانے سے پرہیز کرتے تھے"،

مابعد ہندی برہمنیت میں ان مصری کاہنوں کا رنگ جھلکتا معلوم ہوتا ہے، اسی سلسلے میں تناسخ کے عقیدے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، یہ عقیدہ آج ہندو دھرم کا بنیادی اصول ہے گمر

اس کا مولد مصر کو بتایا جاتا ہے[1]، اسی کیسا تھ یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ویدوں میں ہر جگہ حیات مابعد کے سلسلے میں یہ عقیدہ صاف نظر آتا ہے کہ انسان کی رُوح مرنے کے بعد ایک دوسرے عالم کو منتقل ہوجاتی ہے، جہاں موت کا دیوتا یم حکمراں ہے، اور جہاں کا قیام ابدی ہے، بلکہ بعض منتروں میں اس عالم مابعد کا نقشہ راحت وسرور سے اس قدر لبریز دکھایا گیا ہے، کہ رگوزن اسکو اسلامی جنت کا مکمل نمونہ کہتا ہے، ممکن ہے کہ ہندوستان تک اس عقیدے کی رسائی یونانی وساطت سے ہوئی ہو، یونان ہی وہ ملک تھا جہاں فیثاغورث اور اس کے متبعین نے اس کو فلسفہ کا جزو بنا دیا، اور اس شدت کے ساتھ اس کے قائل ہوئے کہ گوشت کھانا ترک کر دیا، کیونکہ جن جانوروں کو مارا جاتا تھا، ان میں انسانی روح ہونے کا احتمال ہوتا تھا، کہا جاتا ہے کہ سکندر کے آنے سے پہلے ہی ہندوستان اس عقیدے سے آشنا ہوچکا تھا، اور اس کے ساتھیوں کو اس امر پر تعجب ہوا تھا[2]، بہرکیف مصر یونان اور ہندوستان میں ایک ایسے عقیدے کا وجود جس کی طرف مادّی ماحول اور ذاتی تجربہ کی بنا پر ذہن منتقل ہونا ممکن ہے، ان ممالک کے ربط قدیم پر ایک حجت ہے[3]،

مصر اور ہندوستان کے تعلق پر سب سے زیادہ روشنی ڈاکٹر پران ناتھ کے اس سلسلۂ مضامین سے پڑتی ہے، جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک آریہ قوم کا ابتدائی وطن (Agean Sea) کا ساحل تھا، یہاں سے بڑھ کر وہ ایشیائے کوچک اور مصر میں آباد ہوئے، انہی ممالک میں سامی النسل قومیں رہتی تھیں، چنانچہ آریہ اور سامی دست وگریباں ہونے لگے، یہ بین الاقوامی

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، تناسخ، [2] مضمون بر اسلام ونیکٹار تنام ص ۲۰، [3] تناسخ کے اعتقاد سے وید خالی ہیں، اپنشد اور بعد کی کتابوں میں ملتا ہے، (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، مضمون ہندوستان) ممکن ہے قدیم ہندی قوموں سے آریہ فاتحوں نے حاصل کیا ہو، اور قدیم آریہ قوموں کی مصر وغیرہ تک پہنچا ہو (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، مضمون سنسکرت زبان)

جنگ مصر سے شروع ہو کر تمام مغربی ایشیا میں عام ہو گئی، اسی جنگ کے سلسلے میں مصری آریہ لڑتے بھڑتے بابل تک پہنچے، جو غالباً عرصہ تک ان کے قبضہ میں رہا، ڈاکٹر صاحب کے بقول بابل کی قسمت فیصل کرنے والی جنگ بمقام تعبل واقع ہوئی جس میں آریہ آدن نے سامی اننذپت کو شکست دی، اور جس کا مفصل بیان رگ وید میں موجود ہے، دجلہ کی وادی سے آریہ قوم نے ہندوستان کا رُخ کیا، اور سندھ اور پنجاب میں آکر آباد ہو گئے، چنانچہ ڈاکٹر پران ناتھ نے بہت سے مصری اور بابلی نام رگ وید میں مذکور پائے ہیں، بابلی اُرگ وید میں موجود ہے، اِمی شن اور سپتر کے مشہور شہر وید میں ایش پرام اور شپیر کے نام سے وارد ہوئے ہیں، بابل کے بادشاہ سارگن اور اُش وید میں بجنسہٖ منقول ہیں، اسی طرح مصری بادشاہوں کے نام وید میں پائے جاتے ہیں، مثلاً مینس، مندو، اخی تے نان، انارمیدہ وغیرہ ڈاکٹر صاحب کے بقول رگ وید کا ایک خُمس مصری واقعات اور اشخاص سے متعلق ہے،

اس طویل تمہید کا خلاصہ یہ ہے، کہ تاریخی شواہد سے ایک طرف تو ہندوستان اور سامی ایشیا کا تجارتی اور سیاسی تعلق ثابت ہے، اور دوسری طرف ہندوستانی تہذیب اور مغربی ہمسایوں میں قدم قدم پر مماثلت نظر آتی ہے، اگر جدید مورخین کی یہ تحقیق کہ آریہ قوم کا اصلی وطن مغربی ایشیا کے قریب تھا، ناقابلِ قبول کہی جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ آریہ اور سامی قوموں میں ہمیشہ سے عقائد اور روایات کا مبادلہ ہوتا رہا، چنانچہ اب یہ نظریہ کہ رامائن کا افسانہ ایک مصری فرعون سے متعلق ہے، اتنا خلافِ قیاس نہیں رہنا چاہیئے، جتنا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے،

تذکرۂ طاہر

یعنی

سوانحِ خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم،

(۲)

نکاحِ اوّل۔ جب میری عمر پندرہ سال کی ہوئی، تو حضرت والد مرحوم نے ماہ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں میرا نکاح میر حیدر علی صاحب مرحوم ساکن موضع بیتی سادات پرگنہ ہنسوہ ضلع فتحپور کی صاحبزادی عترت النساء بیگم کیساتھ بعوض مہر پانچہزار روپیہ سکۂ رائج الوقت کر دیا، میرا اور برادر گرامی مرحوم کا عقد ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہوا، شیخ عصر حضرت مولینا مولوی شاہ عبد السلام صاحب قدس سرہٗ نے خطبۂ نکاح پڑھا، بعد فراغِ نکاح جب بارات فتحپور ہنسوہ سے بھوپال پہنچی تو فوجِ ریاست نے جلوس اور ماہی و مراتب کیساتھ مقام جہانگیر آباد تک استقبال کیا، اسوقت تک بھوپال میں ریلوے لائن کا اجرا نہیں ہوا تھا، رئیسۂ عالیہ خلد مکان کے جانب سے وہ تمام مراتبِ اعزاز عمل میں آئے، جن کا ذکر برادر معظم کے تذکرۂ واقعات میں گذر چکا ہے، عالیجناب حضور معظمہ محترمہ نواب ولیعہد صاحبہ یعنی نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ خلد آشیاں نے بھی محفلِ تہنیت منعقد کر کے ضیافت وزر و زیور و پوشاکِ گراں بہا سے عزت افزائی کی، رئیسۂ عالیہ خلد مکاں نے میری اہلیۂ موصوفہ کو اعزاز دلہن کا خطاب عطا فرمایا، اور مجکو بعوض عطائے مکان تیس ہزار روپیہ بذریعۂ خطا مورخہ دوازدہم شعبان ۱۲۹۵ھ اور مہر خطاب خانی مرحمت فرما کر عزت بالائے عزت عطا فرمائی

شعرائے پائے تخت نے قصائد و قطعات تاریخ و تہنیت لکھکر حضرت والد محترم کے حضور میں پیش کئے، یہ سب قصائد و قطعات تذکرۂ بزم سخن مؤلفہ راقم الحروف میں طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں،

عطائے اعزاز قبل از نکاح رئیسۂ عالیہ نے پانزدہم ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو جب دہلی میں عظیم الشان دربار قیصری منعقد ہوا تھا، برادر معظم اور راقم الحروف کو اپنا بیج آف آنر بنا کر خاص اعزاز عطا کیا تھا،

عطائے تمغہ ۱۲۹۵ھ میں جب رئیسۂ عالیہ دار السلطنت کلکتہ میں ورود فرما ہوئیں، اور ہزاکسلنسی لارڈ لٹن صاحب بہادر سابق وائسرائے ہند کی ملاقات کے لئے ولیسرِنگل لاج تشریف لے گئیں، اسوقت راقم الحروف بھی ہمراہ تھا، رئیسۂ عالیہ نے ازراہِ مزید شفقت عطائے تمغۂ طلائی سے (جس پر اسم گرامی شاہجہاں کا حرف شین منقوش تھا) سرفراز فرمایا،

تمام ملک محروسۂ بھوپال میں تقرر اردلی و سلامی ۱۳۰۱ھ میں رئیسۂ عالیہ نے ریاست سے نقیب و سواران فوج کی اردلی میری سواری کے ہمراہ بذریعۂ خط مرقومۂ بست و دوم جمادی الاول ۱۳۰۱ھ مقرر کی، اور تمام ملک محروسۂ ریاست میں غرۂ جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ سے تاحین حیات فوج کی سلامی کا حکم صادر فرمایا،

عطائے خطاب و تقرر القاب و آداب، ۱۳۰۱ھ میں جشن تاج محل کے موقع پر خطاب فرزند سعید صفی الدولہ حسام الملک سے مخاطب فرمایا، اور مہر خطاب اپنے دست مبارک سے عطا فرمائی، اور خلعت و فیل و اسپ و جیغہ و ہودج نقرہ و پالکی وغیرہ سے مخلع اور مفتخر فرمایا، خطوط و فرامین سرکاری میں راقم الحروف کا حسب ذیل القاب و آداب قرار دیا، قرۂ باصرۂ سعادت غرۂ ناصیۂ سعادت فرزند سعید میر محمد علی حسن خان صاحب حفظہ اللہ و سلم و بعد دعوات زیادت عمر و درجات و افسح خاطر اقبال توام باد،

من درین رتبہ از کجا لیکن، موری پروردۂ سلیمان است،

دیگر مراتب اعزاز، صاحبان ذیشان پولیٹکل ایجنٹ بہادر و صاحبان عالیشان ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر و ہزاکسلنسیز وسیرایان ہند کے رونق افروزی بھوپال کے وقت مجکو مراسم استقبال و مزاج پرسی و مشائعت و شرکت دربار اور تواضع عطر و پان سے عزت بخشی جاتی تھی، اور سرکاری دربار اور سرکاری تقریبوں کے موقع پر اخوان ریاست میں میری نشست کا نمبر پانچواں رکھا گیا تھا

عطائے جاگیر، اولاً حضور رئیسۂ عالیہ نے ازراہ شفقت ۱۲۸۹ھ میں تاحین حیات مبلغ بارہ ہزار روپیہ سالانہ کی سند جاگیر مورخہ غرۂ صفر ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۲۷۹ فصلی عطا فرمائی تھی،

تجدید سند جاگیر بطور وثیقہ کامل، اس کے بعد ۱۳۰۵ھ میں رئیسۂ عالیہ نے اپنے قدیم شفقت مادرانہ و مراحم شاہانہ سے سند جاگیر کی تجدید فرمائی، اور بجائے حین حیات کے چہارم ربیع الثانی ۱۳۰۶ ہجری مطابق ۱۲۹۷ فصلی سے مبلغ بارہ ہزار سالانہ کی سند جاگیر نسلاً بعد نسل بطناً بعد بطن ابداً موبداً مرحمت فرما کر شرف و اختصاص خاص بخشا، اور بذریعۂ خط مورخہ ہفتدہم ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ ہدایت فرمائی کہ اس سند کو بطور وثیقہ کامل نزدیک اپنے رکھو،

تقرر مشاہرہ و عطائے پوشاک، حضرت والد محترم اپنی جاگیر سے ہم لوگوں کو مصارف سالانہ کے لئے ایک رقم معینہ دیا کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد رئیسۂ عالیہ نے اپنی مادرانہ شفقت سے مبلغ تین سو روپیہ ماہوار میرے اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار میری اہلیہ کے مقرر فرمائے، اور مبلغ ساٹھ روپیہ میری اولاد کی تنخواہ روز ولادت سے مقرر فرمائی، اور سالانہ بارہ جوڑے پوشاک کے میرے لئے اور چھ چھ جوڑے پوشاک کے میری اہلیہ اور اولاد کیلئے اپنی ڈیوڑھی خاص سے عطا ہونیکا حکم صادر فرمایا،

روانگی فوج ۱۳۰۵ھ میں حضرت والد محترم نے ریاست کے اندرونی سیاسی تغیرات اور زمانہ کے روز افزوں انقلابات کو پیش نظر رکھکر اور "معاش امن از بازی روزگار" پر عمل پیرا ہو کر ازراہ دور اندیشی

یہ ارادہ کیا، کہ شہر قنوج میں جو قدیم آبائی وطن ہے، بطور یادگار سلف اور مصالح آیندہ کے لحاظ سے ایک مکان ہم لوگوں کی سکونت کے لئے تعمیر کیا جائے، اور ساتھ ہی اسکے انکی دین پرستی اور معارف نوازی اسکی مقتضی ہوئی کہ جس طرح وہ مجھکو دنیوی مال و متاع سے آسودہ حال دیکھتے ہیں، اسی طرح وہ معارف باطنی کی دولت لازوال سے بھی میرے جیب و دامن کو مالا مال دیکھیں، اسلئے انھوں نے مجکو سفر قنوج کا ایما کیا، اور تعمیر مکان کو میری پسند و مرضی پر محمول کیا، اور سرخیل صوفیائے عصر شیخ وقت حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن صاحب مرادابادی قدس سرہٗ العزیز کے شرف حضوری اور برکات انفاس سے مستفید ہونے کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ بیتو این ماہ جمادی الاول ۱۳۰۵ھ کو دوشنبہ کے دن بھوپال سے روانہ ہو کر چہار شنبہ کے روز میں قنوج پہنچا، اور اپنے جد بزرگوار حضرت سید علامہ مولانا اولاد حسن صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت مجدد عصر مولینا سید احمد صاحب بریلوی شہید قدس سرہٗ کے مزار پر انوار کی زیارت و فاتحہ سے شرف اندوز ہوا، نماز ظہر کے وقت باوجود غایت معذرت بعض مریدان و معتقدان خاص جد مرحوم کے اصرار سے مجبور ہو کر جد مرحوم کی مسجد قدیم میں مجکو امامت کرنی پڑی، فراغ نماز کے بعد حضرت جلال ثالث رحمۃ اللہ علیہ و حضرت بالاپیر رح اور حضرت حاجی شریف زندنی رح کی زیارت مزارات و فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا،

روانگی گنج مرادآباد، پھر وہاں سے چوتھی جمادی الثانی کو گنج مرادآباد روانہ ہوا، جمعہ کے دن مغرب کے وقت وہاں پہنچکر حضرت مرشدنا و مولانا مولوی فضل رحمٰن صاحب رح کی خدمت اقدس میں باریاب ہوا، حضرت طہارت گاہ سے برآمد ہو کر حجرہ کی صحنچی میں وضو کر رہے تھے، مجھ کو دیکھکر فرمایا کہ حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر کے پاس تنہا اور پیدل جایا کرتے تھے، اور حضرت عمر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس

میں بہت دور سے پیادہ پا آیا کرتے تھے اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں وضو کرتا ہوں تم دیکھتے جاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح وضو کیا کرتے تھے، الغرض جب وضو اور نماز سے حضرت فارغ ہوئے تو ایک حاضر الوقت صاحب سے میری نسبت فرمایا، کہ یہ امیر آدمی ہیں، ان کو احمد میاں کے گھر میں ٹھیراؤ، تھوڑی دیر میں جناب احمد میاں صاحب خود آکر مجکو اپنے مکان پر لے گئے، رات بھر وہاں قیام رہا، صبح کو نماز فجر کے بعد پھر مجکو حضرت کے دیدار فائض الانوار سے مستفیض ہونے کا موقع ملا، اور میں نے ان کے دست شریعت و طریقت پناہ پر طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی، قریباً نصف ساعت سے زائد حضرت مراقب رہ کر مجکو اپنی توجہ اور ہمت باطنی سے مستفید فرماتے رہے، اس کے بعد سر اٹھا کر اپنی زبان فیض ترجمان سے بیتابانہ عشق کے لہجے میں فرمانے لگے، اپنے پیا پر تن من واروں جو داروں سو تھوڑا رے، اسوقت برق و روح کے اتصال اور جذبات اور تجلیات کے باہمی امتزاج سے میرے دل پر جو ایک پر سرور والہانہ و وجدانی کیفیت طاری تھی اسکو لفظوں میں ادا کرنا میرے لئے قطعاً ناممکن ہے ؎

لطیفہا کہ بہ لفظ و بیان نمی گنجد   تو چوں فرشتۂ غیب آمدی و واگفتی

بہر حال اس کے بعد حضرت بہت سے اشعار فارسی اور اردو اور ہندی کے ایک دلکش انداز اور پر تاثیر لہجہ کیساتھ ساتھ پڑھتے رہے، اُن میں سے صرف یہ دو شعر مجکو یاد رہ گئے، ؎

پروانہ نیستم کہ بہ یکدم عدم شوم   شمعم کہ جان گدازم و دم بر نیاورم

در کنز و ہدایہ نتوان یافت خدارا   بر صفحۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

اخیر صحبت میں جب میں نے رخصت ہونے کا قصد ظاہر کیا، تو حضرت نے فرمایا کہ تم اپنے والد سے کہدینا، کہ ہم تمہارے لئے دعا کیا کرتے ہیں، خدا آپکو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے، اتباع سنت بہت مشکل ہے، پھر میں حضرت کے پاس سے اٹھکر چلا آیا، تھوڑی دیر کے بعد حضرت حجرہ سے صحن مسجد میں آکر بیٹھ گئے، اور نسائی شریف کا درس جناب احمد میاں صاحب مرحوم کو پڑھانے لگے

میں بھی وہاں جا بیٹھا، دوران سبق میں حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ اسمٰعیل کے معنی جانتے ہو، میں نے عرض کیا کہ آپ ارشاد فرمائیں، حضرت نے کہا کہ اسمٰعیل کے معنی ہیں خدا کا فرمانبردار، جب درس سے فراغت ہوئی، تو آپ نے صحنِ مسجد میں ٹہلنا شروع کیا، اور میرے قریب تشریف لاکر اور مسکراکر آہستہ سے ازراہِ شفقت میری پشت پر مکا مارا، اور حُجرہ میں تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد جناب احمد میاں صاحب کی ہمراہی میں پھر حضرت کے حجرہ میں پہنچا، اور توفیقِ الٰہی کے موافق نذر دکھائی، آپ نے زرِ نذرانہ کو خوشی کیساتھ اپنے دامن میں لے لیا، اور وہیں کھڑے کھڑے میرے سامنے تمام زرِ نذرانہ ضرورتمندوں اور محتاجوں کو تقسیم کر دیا، اور ایک حبہ باقی نہیں چھوڑا، پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، کہ تم کو یہاں آنے سے کیا فائدہ ہوا، اپنا نقصان مفت میں کیا، چونکہ میں اسی وقت لکھنؤ روانہ ہونیکے لئے تیار تھا، اور سواری کچھ دور کھڑی ہوئی تھی، میں نے مراجعتِ وطن کی اجازت چاہی حضرت نے خدا حافظ کہکر اور یہ شعر پڑھکر مجکو رخصت کیا، ؎

دیدۂ سعدی و دل ہمراہِ تست تو نہ پنداری کہ تنہا می روی

اس سفر میں تین روز تک میرا قیام لکھنؤ میں رہا، پھر وہاں سے موضع بیتی سادات پرگنہ ہنسوہ ضلع فتحپور اور جہانپور ہوتا ہوا چہار دہم جمادی الثانی ۱۳۰۵ھ کو بھوپال پہنچا، اور تمام حالات و واقعات حضرت والد محترم سے بیان کئے، اور شہر قنوج کی سکونت کے متعلق میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، یہ شہر اگرچہ قدیم زمانہ میں ہندوستان کا پایۂ تخت اور راجدھانی رہا ہے، مگر امتدادِ زمانہ اور انقلابِ روزگار سے اب وہ ایک قصبۂ تباہ حال سے زائد وقعت نہیں رکھتا، وہاں کے سکنۂ شہر میں بھی کوئی فضیلتِ علم و عمل و دولت و ثروت باقی نہیں رہی، اور حضرت والد مرحوم اور اہلِ خاندان کے ترکِ وطن اور ترکِ تعلق کے سبب سے جو آبائی تعلقات اس سے وابستہ تھے، وہ کلیۃً منقطع ہو چکے تھے، اسلئے میں نے وہاں کی اقامت پسند نہیں کی، اور صاف صاف اپنا خیال حضرت والد مرحوم پر ظاہر کر دیا،

والد مرحوم ابقاء المنن کے صفحہ ۱۴۰ میں لکھتے ہیں، کہ میں نے بمجبوری یہ قصد کیا تھا کہ وطن قدیم بلدۂ کہنہ قنوج ہی میں طرحِ توطن ڈالی جائے، لیکن غرہ جمادی الثانی ۱۳۰۵ھ کو جب عزیزی میر علی حسن خان نے اسکو ملاحظہ کر کے ناپسند کیا، تو خیال اس جگہ کا چار ناچار خاطر فاتر سے دور کیا گیا، وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔

وفات زوجۂ اولیٰ راقم الحروف، مراجعتِ وطن کے آٹھ نو ماہ کے بعد میری اہلیہ موصوفہ نے بحالتِ وضعِ ولادت بست و یکم ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق بست و ششم نومبر ۱۸۸۸ء کو روز دوشنبہ چار ساعت صبح انتقال کیا، رحمھا اللہ تعالیٰ اسوقت سے تمام انتظام خانہ داری اور خردسال اولاد کے غور و پرداخت کا مجکو بذات خود جزءاً و کلاً متکفل ہونا پڑا، ؎

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

میری یہ بیوی نہایت نیک مزاج کم سخن، پاکیزہ خصلت اور عفت و محبت کی مجسم تصویر تھیں غفر اللہ لہا، میرے محبِ مکرم جناب مولوی جمیل احمد صاحب سہسوانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا، ؎

بانوی خواجہ زادۂ من حسرتا بمرد پیوستہ باد رحمتِ حق بر روانِ او،
بے اختیار ریختہ از دیدہ اشک سرخ برنا و پیر در غمِ مرگِ جوانِ او،
جا داشت آن کہ در دل ممدوح زادہ ام امروز حیف کنج لحد شد مکانِ او،
بے پاسبان و خادمہ یا رب نماندہ است حوراں شوند خادمہ و پاسبانِ او،
بے سایہ زیر چرخ کسی نارمیدہ است کن فضلِ خود بزیر زمین سائبانِ او
این گفتش ز مسالتِ منکر و نکیر، حرفے زدن بغیر چہ و اندر زبانِ او
ناخواندہ مہمان نبود تا برانیش مہمان خواندہ است بشو میزبانِ او

دیگر دہم چہ شرح تو دانی دکارتو، او مہمان و رحمت تو میزبان او،

نکاح ثانی راقم الحروف، حضرت والد محترم کو میری زوجۂ اولیٰ کی وفات ۱۳۰۶ھ کے بعد ہی سے میرے نکاح ثانی کی تشویش و فکر دامنگیر ہوگئی تھی، چنانچہ اونھوں نے لکھنؤ میں اسکی سلسلہ جنبانی شروع کی چونکہ اکابر سادات و شرفائے لکھنؤ کے خاندانوں میں خواجہ سید جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب مودودی مرحوم کا دودمانِ سیادت ممتاز شہرت رکھتا تھا، اسلئے یکم جمادی الاول ۱۳۰۶ھ مطابق جنوری ۱۸۸۹ء کو انکی دختر کلاں ماہ جبیں بیگم کے ساتھ میرا عقد ثانی بعوض پانچہزار روپیہ مہر معجل کے کر دیا، اعیانِ لکھنؤ و اکابر بھوپال تقریب مذکور میں شریک تھے، خطبۂ نکاح حضرت شیخ الحدیث مولینا شیخ حسین صاحب عرب مرحوم متوطن حدیدہ حال ساکن بھوپال نے پڑھا، شجرۂ نسب حضرت صاحب مرحوم کا حسب ذیل ہی،

ماہ جبیں بیگم بنت خواجہ سید جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب بن خواجہ نظام الدین احمد عرف حضرت سید فقیر صاحب مودودی بن سید شاہ خواجہ حسین بن خواجہ سید ابراہیم بن خواجہ غیاث الدین بن خواجہ سید محمد شریف بن شیخ سید ابراہیم معروف بخواجہ کماں بن خواجہ سید محمد صالح بن خواجہ سلطان محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ افریس بن خواجہ محمد یحییٰ بن خواجہ ابی احمد بن سید قطب الدین بن سید رکن الدین بن سید ابی احمد بن سید سلطان الاسلام خواجہ قطب الدین مودودی بن سید ابو یوسف ناصر الدین چشتی بن سید خواجہ محمد بن سید خواجہ سمعان بن سید خواجہ محمد بن سید عبد اللہ بن سید ابن الحسن بن امام جواد بن امام محمد تقی، بن امام موسیٰ رضا، بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق، بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن حضرت امام حسین بن حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

لکھنؤ سے جب بارات روانہ ہو کر بھوپال پہنچی، تو فوج ریاست نے جلوس و ماہی مراتب کے ساتھ بھوپال کے اسٹیشن تک استقبال کیا، میں نے اپنے مکانِ مسکونہ نور محل میں داخل ہونے سے قبل مسجد نور محل میں داخل ہونے سے قبل مسجد نور محل میں نماز دوگانہ تحدیثاً بنعمۃ اللہ ادا کی، شام کو سہ پہر کے وقت رئیسہ عالیہ نے نور محل میں رونق افروز ہو کر عروس کی رونمائی کی رسم ادا کی، اور میری اہلیۂ موصوفہ کو

دیکھ کر بہت مسرور ہوئیں، حضرت والد محترم سے مسکرا کر فرمایا، کہ یہ آپ کی نہیں بلکہ خاص میری بہو ہے، پھر کچھ دیر قیام فرما کر وقت مغرب مراجعت فرمائے تاج محل ہوئیں، جمعہ کے روز رئیسہ عالیہ نے تاج محل پر ایک نہایت پرتکلف محفلِ ضیافت ترتیب دے کر میری اہلیۂ موصوفہ کو افتخار دُولہن کے خطاب سے سرفرازی بخشی، اور ہم دونوں کو عطائے پوشاک زرنگار اور زر و زیور طلائی و مرصع سے مشرف و مفتخر فرمایا،

شعرائے پایۂ تخت حکیم اعظم حسین صاحب سندیلوی، و حافظ سید محمد سورتی صاحب، منشی فدا علی صاحب فارغ، مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی، شیخ محمد صاحب عرب حدیدی یمنی اور مولوی جمیل احمد صاحب سہسوانی نے تہنیت میں قطعات لکھ کر حضرت والد محترم کے حضور میں پیش کئے،

بحمدہ تعالیٰ میری اہلیۂ ثانیہ نہایت صالح، نظافت پسند، غایت درجہ فیاض اور عفت و حیا کی مجسم مرقع ہیں، سیم و زر کی اُن کے دستِ گہر پاش کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، قلب خاشع اور طبیعتِ متواضع رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اور ہماری اولاد کو صراط مستقیم و طریقۂ انیقہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قائم و ثابت قدم رکھے، وہو ولی التوفیق،

(باقی)

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب و لہجہ دلآزی اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا طرزِ بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۰۰۰ صفحے، قیمت ۱۲ر، **منیجر**

مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم

"برٹش ایسٹ افریقہ کے شہر ممباسہ واقع کینیا سے ہم کو حسب ذیل خط موصول ہوا،
جو افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے"

"س"

مکرمی معظمی جناب مولینا سید سلیمان ندوی صاحب دام اقبالکم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

پچھلے سال نافروری ۱۹۳۵ء کے رسالہ معارف کے شذرات میں جناب نے نوآبادیات میں اسلامی تعلیم کی کمی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشرقی افریقہ کا ذکر بھی فرمایا تھا، اسی وقت خیال آیا، کہ جناب کی خدمت اقدس میں برٹش ایسٹ افریقہ کے عام مسلمانوں کی حالت کا نقشہ پیش کروں، لیکن افسوس کہ کاروبار کی الجھنوں نے اس کام کی التوا میں ڈلوار کیا، آج اتفاقًا وہی رسالہ معارف نظر سے گذرا، تو دوبارہ خیال پیدا ہوا، آج اسکو عملی جامہ میں آپکی خدمت میں پیش کر رہا ہوں،

محترم آپنے جو تعلیمی نقشہ اسلامی دنیا کا نوآبادیات کی بابت کھینچا ہے، وہ بالکل درست اور بجا ہے، لیکن آپ یہ سن کر خوش ہوں گے، کہ کینیا کولونی کے ہندوستانی مسلمانوں نے اس کمی کو محسوس کرکے ۱۹۳۳ء میں ایک انجمن دارالسلطنت نیروبی میں قائم کی، جس کا نام انجمن حمایت اسلام رکھا، اس کی کوششوں سے مسلمانوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہو گیا ہے، چونکہ موجودہ تجارتی حالات کی وجہ سے انجمن کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں، جتنی ہونی چاہئے، پھر بھی اپنے مقدور کے

مطابق کافی سے زیادہ کام کر رہی ہے، اور اب تک مندرجۂ ذیل کام سرانجام دے چکی ہے، انجمن کے سرپرست مولانا حاجی سید عبد اللہ شاہ صاحب اور مولینا عبد المومن صاحب مرحوم تھے، مولینا عبد المومن صاحب پچھلے سال وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ دونوں حضرات مشرقی افریقہ میں عالم جید تھے اور محض مختلف عقائد رکھنے والے مسلمانوں ہی میں نہیں، بلکہ غیر مسلموں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

۱- مرزائی اعتقادات کی مکمل بیخ کنی کر چکی ہے، کیونکہ یہاں یہ وبا اور فتنہ پھیل چلا تھا،

۲- کینیا کولونی، یوگنڈا، اور ٹانگانیکا کے بڑے بڑے شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہیں جو اپنے اپنے شہر میں مسلمانوں کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح میں کوشاں ہیں،

۳- نیروبی میں افریقی مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیم کا انتظام اور تبلیغ اسلام کے لئے خاص مبلغ (جو کہ افریقی لوگوں میں سے ہوں گے) تیار کرنے کا کام، ان کے تمام اخراجات طعام، لباس اور رہائش وغیرہ انجمن برداشت کرے گی،

۴- ان دنوں انجمن نے اپنا پریس منگوایا ہے، جس میں ہفتہ وار اخبار نکلے گا، جو سردست انگریزی اور اردو میں ہوگا،

۵- اس سے قبل ہفتہ وار ٹریکٹ نیروبی سے اردو زبان میں نکلتے تھے، جو تمام شہروں میں تقسیم کئے جاتے تھے،

۶- انجمن نے ایک عالم مولینا محمد حسین صاحب فاضل دیوبندی کی خدمات حاصل کرلی ہیں، جن کے فرائض مندرجۂ ذیل ہیں، بر انجمن کی دعوت پر دوسرے شہروں میں دورہ، خاص نیروبی شہر میں قرآن اور حدیث شریف کا جامع مسجد میں روزانہ درس (جسمیں حاضرین کی تعداد تقریبًا سو اسو ہوتی ہے) ایک دوسرے بزرگ مولینا محمد حسین صاحب، حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی کی وساطت سے یہاں آئے ہیں،

۷۔ مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، ان پڑھ مسلمانوں کے لئے نائٹ اسکول جاری کئے گئے ہیں،

۸۔ مولینا محمد حسین صاحب کے قبل انجمن نے مولانا لال حسین اختر صاحب کی عارضی خدمات انجمن احمدیہ اسلام لاہور کی معرفت حاصل کی تھیں جنھوں نے اپنی فرائض کو اس طرح تن دہی سے انجام دیا، کہ ان کی کوششوں اور خداوند کریم کے فضل وکرم سے انجمن کی مالی حالت بھی درست ہو گئی، بر انگریز بھی کافی دلچسپی لینے لگ گئی ہیں، اور مرزائیت کو انھوں نے موت کے گڑھے میں ڈال دیا ہے، اس کام میں وہ خاص ملکہ رکھتی ہیں،

۹۔ ہر اتوار کو اسلامی لکچر ہوتا ہے جس میں ہر خیال کے مسلمان شریک ہوتے ہیں، اس سرزمین میں اگرچہ ہر عقیدہ کے مسلمان ہیں، لیکن تمام کام آپس میں اتحاد اور اتفاق سے طے پاتے ہیں، کوئی مذہبی جھگڑا نہیں، صرف مرزائی فرقہ ایک لعنت تھی، اس کا خداوند کریم نے کافی سدباب کر دیا،

۱۰۔ اب انجمن قرآن حکیم کا سواحلی زبان (یعنی افریقہ میں جو عام رائج زبان ہے) میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کرتی ہے، اور ساتھ ہی سیرۃ الرسول بھی اس زبان میں شائع کرے گی،

اخیر میں ایک افسوسناک خبر بھی گوش گذار کر دیتا ہوں، کہ انجمن مذکور کے محترم صدر سید احمد الحداد صاحب کو کن (جو بڑے بارسوخ اور متمول شخص تھے، اور چار سال سے انجمن کے صدر تھے) اس سے ایک ہفتہ قبل موٹر کار کے حادثہ میں داغ مفارقت دے گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، ان کی موت نے مشرقی افریقہ کو چند دنوں کے لئے ماتم کدہ بنا دیا، سید صاحب مرحوم نے چار سال تک جس تن دہی سے انجمن کی خدمت کی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ڈاکٹر خالد شیلڈریک جب یہاں دبلی آکر ایک ہفتہ رہے، تو انھوں نے صدر صاحب کی عدم موجودگی میں یہ الفاظ فرمائے، "کہ میں تمام اسلامی دنیا میں پھر آیا ہوں، لیکن جس قسم کا صدر یہاں کی انجمن کو ملا ہے، اس قسم کے آدمی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئے"۔

آپ کا تابعدار محمد اسمٰعیل ٹھیکیدار،

ممباسہ (کینیا)

تلخیص و تبصرہ

نادر شاہ ایرانی اور اتحاد اسلامی

نادر شاہ نے شیعہ اور سنیوں کو باہم متحد کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کا مختصر تذکرہ معارف اپریل ۱۹۲۲ء کے مضمون خلافت میں آج سے پندرہ سال پہلے گذر چکا ہے، اب مسلمان (کلکتہ) کے گذشتہ عید نمبر میں ایک مفصل مضمون حوالۂ قلم ہوا ہے، اس کوشش میں علامہ عبداللہ سویدی کی خدمت بھی بہت نمایاں تھی، اور موصوف نے اس پر ایک رسالہ الحجج القاطعہ تحریر فرمایا تھا جس کے بعض حصے اس مضمون میں نقل کئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہو گا، کہ کن اسباب کی بنا پر یہ کوشش ناتمام رہی، اب آج تمام مسلمانوں کے لئے یہ قابل غور مسئلہ ہے، کہ اب جب اسلام کے سیاسی حالات میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو چکا ہے، اور سنیت اور شیعیت ترکی اور ایرانی سلطنتوں کے تعمیری اجزا باقی نہیں رہے، ان ہی مقررہ اصول کے طرز پر فریقین کے درمیان کیا اب صلح کی دفعات مرتب نہیں ہو سکتیں، ؟ خصوصاً اس حالت میں کہ سلطان ابن سعود نے حرمین محترمین سے چار مصلوں کی بدعت بھی مٹا دی ہے،

"متعدد فتوحات کے بعد جب ۱۱۴۸ھ میں نادر شاہ وادی مغاں میں داخل ہوا تو اعیان سلطنت نے ایران کا تاج اس کے سامنے پیش کیا، لیکن اس نے تاج کے قبول کرنے سے اسوقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شیعہ اور اہل سنت کا اختلاف دور نہ ہو جائے، تاریخ جہاں کشا میں ہے کہ اس نے

ایرانی سرداروں سے حسب ذیل گفتگو کی:۔

نبی کریم صلعم کی وفات کے بعد آپ کے چار صحابہؓ خلافت پر مامور ہوئے، اس واقعہ کو ہندوستان روم (ترکی) ترکستان اور دوسرے ملک نے تسلیم کر لیا ہے، قدیم زمانہ میں ایران کا بھی یہی عقیدہ تھا، پھر شاہ اسمٰعیل صفوی نے ملکی اسباب کی بنا پر اُسے ترک کر دیا، اگر اہلِ ایران چاہتے ہیں کہ میں بادشاہی قبول کروں، اور وہ خود اپنی اصلاح کے بھی خواہشمند ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ اختیار کر لیں، جو ہمارے آبا و اجداد کا مسلک تھا، چونکہ امام جعفر صادق کو جو ہمارے نبی کی اولاد میں ہیں، تمام مسلمان امام تسلیم کرتے ہیں، نیز چونکہ اہلِ ایران انکے مسلک سے واقف ہیں، لہذا انھیں چاہیے کہ امام موصوف کے مسلک کو اپنا مذہب بنا لیں،

لوگوں نے یہ شرط منظور کی، اور ایک محضر تیار کر کے اس پر اپنی مہریں ثبت کر دیں، اس کے بعد نادر شاہ نے تاج قبول کر لیا، اور اس واقعہ کی اطلاع امیر المومنین سلطان ترکی کی خدمت میں بھیجی، تاکہ دولتِ عثمانیہ اور حکومتِ ایران کے اختلافات دور ہو جائیں، اور دوستانہ تعلقات پھر قائم ہو جائیں،

نادر شاہ نے دربارِ خلافت میں جو مراسلہ بھیجا، اسمیں مندرجۂ ذیل امور کی درخواست بھی کی:۔

۱۔ چونکہ اہلِ ایران ان عقائد سے تائب ہو گئے ہیں، جو اب تک بنا ے مخالفت تھے، اس لئے امید ہے کہ امیر المومنین اور علماے دولتِ عثمانیہ جعفری مذہب کو اسلام کا پانچواں مذہب تسلیم کر لیں گے،

۲۔ حرم کعبہ میں چار مصلّوں کے علاوہ ایک پانچویں مصلّے یعنی جعفری مُصلّے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ ہمارے آدمی اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کر سکیں،

۳۔ ایرانی زائرین کو ایک ایرانی میر حج کی قافلہ سالاری میں مکہ معظمہ جانے کی اجازت دیجائے، اور عثمانی عمّال اس قافلے کے لئے ویسی ہی سہولتیں بہم پہنچائیں، جیسی مصر اور شام وغیرہ کے قافلوں

کو پہونچائی جاتی ہیں،

۴۔ جنگ کے قیدیوں کو جو دونوں حکومتوں میں ہیں، آزاد سمجھا جائے، اور انھیں غلام نہ بنایا جائے،

۵۔ دونوں حکومتیں اپنے مستقل سفیر ایک دوسرے کے دار السلطنت میں متعین رکھیں، تاکہ باہمی معاملات بہ حسن و خوبی طے ہوتے رہیں،

چونکہ بابِ عالی میں مذکورۂ بالا معروضات بے اثر رہے، اسلئے جب ۱۱۵۶ھ ہجری میں نادر شاہ نجف گیا، تو اُس نے سُلطان سے ان مطالبات کی منظوری حاصل کرنے کی ایک بار اور کوشش کی، اس نے اپنی سلطنت کے تمام بڑے بڑے علما، اور سر برآوردہ اشخاص کو دعوت دی، کہ ایک مجلس منعقد کر کے معاہدۂ مغان کی تجدید و تصدیق کریں، چنانچہ احمد پاشا والی بغداد کو بھی لکھا گیا کہ وہ ایک ایسا عالم روانہ کرے، جو دینیات کا فاضل ہو تاکہ ثالث کی حیثیت سے فریقین کے اختلافات دور کر کے ان کو باہم ملا سکے، احمد پاشا نے اس خدمت کے لئے علامہ عبد اللہ سویدی کو منتخب کیا، جو اپنے وقت میں بغداد کے سب سے بڑے فاضل تھے،

یہ مجلس کامیاب ہوئی، معاہدۂ مغان از سر نو مستحکم کیا گیا، نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو ایران کے تمام حصّوں میں مجلس کے فیصلہ کا اعلان کرنے اور خلفاے اربعہؓ کے نام تمام ایران میں جمعہ کے خطبے میں داخل کرانے کے لئے روانہ کیا، اس نے مجلس کی روئداد دربارِ خلافت میں قسطنطنیہ بھیجی، اور اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے پھر استدعا کی، ترکی شیخ الاسلام اور سلطان محمود خان پہلے دو مطالبات پر راضی نہیں ہوئے، یعنی جعفری مذہب کو تسلیم کرنا، اور کعبہ میں ایک پانچواں مصلّٰی قائم کرنا، نادر شاہ نے بھی معاملہ کی دشواری دیکھ کر زیادہ زور نہیں دیا، اور بقیہ تین مطالبات کی منظوری پر قناعت کر لی، سنہ ۱۱۶۰ھ ہجری میں بالآخر سلطنتِ عثمانیہ اور حکومتِ ایران کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب ہو گیا،

علامہ عبد اللہ سویدی نے ایک رسالہ الحجج القاطعہ فی اتفاق الامم الاسلامیہ کے عنوان سے لکھا ہے، جس میں انھوں نے بغداد سے نجف تک کے سفر اور اس مجلس کے حالات بیان کئے ہیں، اسکے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں :۔

"میں دوران سفر میں فریقین کے امکانی دلائل کے سوچنے اور مرتب کرنے نیز جو اعتراضات پیش کئے جا سکتے تھے، ان کے جوابات تیار کرنے میں تمام تر منہمک رہا، یہ انہماک اور اعتراضات کے جوابات معلوم کرنے اور شبہات کے دور کرنے کی کوشش اس وقت تک جاری رہی، جب تک میں نے اپنے ذہن میں سو سے زیادہ امکانی سوالات اور ہر سوال کے ایک، دو یا تین جواب اس شبہہ کی مناسبت سے جو اس کے متعلق پیدا ہو سکتا تھا، مرتب نہ کر لیا، ان باتوں کا اثر مجھ پر اتنا پڑا کہ میں بیمار ہو گیا"

اس کے بعد علامہ موصوف نادرشاہ کی ملاقات کا حال بیان کرتے ہین :۔

"میں نے اپنے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جیسا کہ اسکی نشست سے اندازہ ہو سکتا تھا، اس کے سر پر قلنسوہ کے مثل جو اہل ایران پہنتے ہیں، ایک بند چوکور ٹوپی تھی، اس پر ایک عمامہ تھا جو موتیون، لعل، ہیرے اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا، گلے میں موتیون اور لعل کا ایک ہار تھا، بازوؤں پر بازو بند تھے جن پر موتی، ہیرے اور لعل ٹکے ہوئے تھے، اس کے چہرے سے بوڑھاپے کی علامتیں ظاہر تھین، سامنے کے دانت گر گئے تھے، عمر تقریباً اسی سال تھی، داڑھی میں نیل کا خضاب تھا، بھنویں مثل دو کمانوں کے تھیں، آنکھیں کسی قدر بھوری لیکن خوبصورت تھیں، چہرہ بحیثیت مجموعی خوشنما تھا، جوں ہی میری نظر اس پر پڑی، میرے دل سے تمام ہول زائل ہو گیا، اور اسکی طرف سے جو خوف تھا، وہ سب جاتا رہا، وہ بیٹے کی طرح مجھ سے ترکمانی زبان میں مخاطب ہوا، اور پوچھا کہ احمد خان کیسا ہے ؟ میں نے جواب دیا کہ بخیریت ہے، پھر اس نے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمکو کیوں بلایا ہے ؟ میں نے کہا نہیں، تب اُس نے کہا :۔ میری مملکت میں دو گروہ ہیں یعنی ترکستان اور افغانستان کے لوگ جو ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں، اور مذہب میں کفر میرے نزدیک ایک نفرت انگیز چیز ہے،

ایسا نہ ہونا چاہئے، کہ میری حکومت کے اندر بعض جماعتیں بعض دوسری جماعتونکو کافر کہیں، اب میں تمھیں اپنا وکیل مقرر کرتا ہون، اور تم سے کہتا ہوں کہ تمام زندقہ کا استیصال کر دو اور ان تینوں گروہوں کے درمیان جو معاہدہ ہو میری طرف سے اس کے گواہ رہو جو کچھ تم سنو اور دیکھو، اسکی اطلاع مجھے دو، نیز احمد خاں کو بھی اس سے مطلع کرو، پھر اوس نے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی، اور حکم دیا کہ میرا قیام اعتماد الدولہ کے مکان پر ہو، اور بعد نماز ظہر میں ملا باشی سے ملاقات کر دن، میں حضور شاہ سے بڑی خوشی اور مسرت کی حالت میں نکلا، کیونکہ نائبی کی خدمت مجھے عطا کی گئی تھی"،

"جب میں ملا باشی کی خدمت میں پہنچا تو وہ نکل کر میرے استقبال کے لئے آیا، وہ ایک چھوٹے قد کا آدمی ہے، گندمی رنگ، جلنے سے جو نشان کنپٹی پر پڑ گیا ہے، وہ سر کے درمیان تک پہنچا ہے، میں گھوڑے سے اتر پڑا، اس نے مجھے تعظیم دی، اور تخت پر بٹھایا، اور خود ایک شاگرد کی طرح میرے سامنے بیٹھا، پھر ہمارے درمیان گفتگو شروع ہوئی" (اوس کے بعد مذہبی مباحثہ کی تفصیلات ہیں)

"شاہ کو اس بحث کی اطلاع بالکل صحیح صحیح دے دی گئی، اُوس نے علماے ایران، علماے افغانستان اور علماے ماوراء النہر کو حکم دیا، کہ جمع ہو کر بدعت و زندقہ کے ختم کرنے کا فیصلہ کریں، مجھ سے کہا کہ تم میرے نمایندہ کی حیثیت سے انکو دیکھتے رہو، اور زیر بحث مسائل پر جو اقرار نامہ انکے درمیان مرتب ہو اسکے گواہ رہو"

جلسہ کے روز مجمع بہت تھا، حضرت علیؓ کے روضہ کے پیچھے ایران کے ستر علما مجتمع ہوئے ان میں مفتی اردلان کے سوا اور کوئی سُنّی نہ تھا، میں نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی، اور جو لوگ ان میں سے زیادہ اہم تھے، ان کے نام لکھ لئے .... اس کے بعد افغان علما آئے، میں نے ان کے نام بھی لکھ لئے .... تھوڑی دیر کے بعد علمائے ماوراء النہر آئے جنکی تعداد سات تھی ... . میں نے ان کے نام بھی لکھ لئے، جب مجلس باقاعدہ طور پر بیٹھ گئی، تو ملّا باشی نے بحرالعلم (یہ لقب علامہ ہادی خواجہ کا تھا، جو علمائے ماوراالنہر میں سب سے زیادہ ممتاز تھے) کو مخاطب کرکے پوچھا، "کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں"؟ یعنی مجھے، انھون نے جواب دیا، کہ "نہین"، تب ملّا باشی نے کہا: "یہ شیخ عبداللہ آفندی ہیں، جو سُنّی فرقہ کے اکابر علما میں ہیں، انھیں وزیر احمد پاشا نے شاہ کی دعوت پر بھیجا ہے، تاکہ اس جلسہ مین ثالث کی حیثیت سے موجود رہیں، یہ شاہ کے وکیل ہیں، لہذا اگر ہمارے درمیان کسی بات پر اتفاق ہوگا، تو وہ ہم سب کی طرف سے اوس کے گواہ ہون گے، اب بتائیے آپ کن باتوں کی وجہ سے ہم پر کفر کا الزام رکھتے ہین، تاکہ ہم شیخ عبداللہ کی موجودگی میں اُن سے باز آجائیں، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ ابوحنیفہ کے مسلک کی رو سے بھی ہم کافر نہیں ہیں، وہ اپنی کتاب جامع الاصول میں کہتے ہیں، کہ اسلام پانچ فرقوں کو تسلیم کرتا ہے، اور انھوں نے امامیہ فرقہ کے پانچویں مذہب ہونے کا اقرار کیا ہے، صاحب المواقف بھی امامیہ فرقہ کو اسلامی فرقوں میں شمار کرتے ہیں، ابوحنیفہؒ اپنی فقہ الاکبر میں کہتے ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو اور وہ سید جس کا نام میں اسوقت بھول رہا ہون، انھوں نے ہدایۃ الفقہ الحنفی کی شرح میں لکھا ہے، کہ یہ صحیح ہے کہ امامیہ فرقہ اسلامی فرقوں میں سے ایک ہے، لیکن جب آپ کے علمائے متاخرین آئے، تو انھون نے ہمکو کافر کہنا شروع کیا، اور اسی طرح ہمارے علمائے متاخرین آپ لوگون کو کافر کہنے لگے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ آپ کافر ہیں نہ ہم، بہرحال وہ باتیں بتائیے، جو آپکے علمائے متاخرین

نے بیان کی ہیں، اور جن کی بنا پر آپ لوگون نے ہمیں کافر کہا ہے، تاکہ ہم انھیں ترک کردین"،

ہادی خواجہ بحرالعلم:- آپ کافر ہیں اسلئے کہ شیخینؓ پر تبرا کہتے ہیں،

ملّا باشی:- ہم شیخین پر تبرا کہنا چھوڑتے ہیں،

بحرالعلم:- آپ کافر ہیں اسلئے کہ صحابہ کو گمراہ اور کافر بتاتے ہیں،

ملا باشی:- تمام صحابہؓ عادل تھے،

بحرالعلم:- آپ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ پر حضرت علیؓ کو فضیلت دیتے ہیں، آپ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کو ملنی چاہئے تھی،

ملّا باشی:- رسول اللہ صلعم کے بعد سب سے بہتر ابوبکرؓ تھے، ان کے بعد عمرؓ تب عثمانؓ اُسکے بعد علیؓ بن ابی طالب، اور اُن کا منصب خلافت پر مامور ہونا اُن کی فضیلت کی ترتیب کے مطابق تھا،

بحرالعلم:- جب صورت حال یہ ہے، تو آپ مسلمان ہین، ہمارا نفع نقصان آپ کا نفع نقصان ہے،

سب لوگوں نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملائے، اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی، تینون گروہوں نے جلسہ کی کارروائی اور اپنے فیصلہ کی مجھ سے تصدیق کرائی ۲۴ شوال چہار شنبہ کے روز قریب مغرب جلسہ برخاست ہوا"،

دوسرے روز نادر شاہ کے حکم سے یہ مجلس پھر منعقد ہوئی، اور شاہی مفتی آقا حسین نے نادر شاہ کا فرمان پڑھ کر سنایا، وہ فرمان یہ تھا:-

"بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے نبیوں کا بھیجنا مقرر فرمایا، وہ یکے بعد دیگرے نبیوں کو بھیجتا رہا، یہان تک کہ سب سے آخر ہمارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، جب آپکا انتقال ہوا، تو چونکہ آپ نبیوں اور رسولوں میں سب سے آخری تھے، اسلئے آپ کے صحابہؓ نے

آپ کی جانشینی کے لئے اپنے میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دانشمند شخص ابو بکر صدیقؓ بن ابی قحافہ کو منتخب کیا، انھوں نے جمع ہو کر بالاتفاق حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا فیصلہ کیا، اور سب نے مل کر اُن کی اطاعت اور وفاداری کا حلف لیا، ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے، انھوں نے بھی برضا و رغبت اور بغیر کسی جبر یا دباؤ کے یہ حلف لیا، اس طرح بیعت اور خلافت کی تصدیق ہوئی اور صحابہ کا اتفاق آرا اس امر قطعی کا قطعی ثبوت تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کی تعریف فرمائی ہے، کہ "بیشک اللہ مومنوں سے خوش ہوا جب کہ انھوں نے درخت کے نیچے تمھاری اطاعت کا حلف لیا" یہ صحابہ تعداد میں سات سو تھے، اور حضرت صدیقؓ کی بیعت کے وقت سب موجود تھے، نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ "میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں، ان میں سے جس کسی کی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے" حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلافت کیلئے اپنا جانشین حضرت عمرؓ بن الخطاب کو نامزد کیا، اور تمام صحابہ نے ان کے سامنے بیعت کی، جس میں حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی شامل تھے، اس طرح حضرت عمرؓ کی بیعت صحابہ کے متفق علیہ فیصلہ کے مطابق بھی تھی، اور خود خلیفہ کی ہدایت کے مطابق بھی، حضرت عمرؓ نے خلافت کا مسئلہ چھ آدمیوں کی ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس میں ایک حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی تھے، مجلس نے حضرت عثمانؓ بن عفان پر اتفاق کیا، جب وہ اپنے گھر میں شہید کئے گئے، اور اپنا جانشین نامزد نہ کر سکے، تو خلافت کا عہدہ معطل رہا، پھر صحابہ نے اس روز سہ پہر کو حضرت علیؓ بن ابی طالب کی خلافت پر اتفاق کیا، یہ چاروں حضرات رض ایک ساتھ ایک مقام پر اور ایک وقت میں تھے، لیکن ان کے درمیان کبھی کوئی لڑائی جھگڑا یا تکرار نہیں ہوئی، برخلاف اس کے وہ ایک دوسرے کا اسقدر احترام اور مدح سرائی کرتے تھے، کہ جب حضرت علیؓ سے شیخین رض کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ "وہ دو راستباز اور عادل رہنما تھے، وہ حق پر زندہ رہے، اور حق پر مرے" اسی طرح جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے فرمایا، "کیا تم میرے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہو جب کہ علیؓ تمھارے درمیان ہیں؟" اے

اہل ایران تم کو معلوم ہونا چاہئے، کہ ان حضرات کی فضیلت اور جانشینی کی ترتیب وہی تھی، جو بیان کی گئی، اب اگر تم میں سے کوئی شخص ان پر تبرا کہے گا یا ان کی عیب جوئی کرے گا، تو اس کی دولت اُس کے بال بچے، اس کے اعزہ و اقربا اور اس کا خون شاہ کے لئے جائز ہو جائے گا، اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اُس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی، جب تم نے ۱۱۴۸ھ میں وادی مغاں میں میری وفاداری کا حلف لیا تھا، تو میں نے یہ شرط تم پر پہلے ہی عائد کر دی تھی، کہ تبرا یک قلم موقوف کر دیا جائے گا، چنانچہ اب میں اسکو بند کرتا ہوں، آیندہ اگر کوئی صحابہ پر تبرا کہے گا تو میں اُسے قتل کر دوں گا، اس کے بال بچوں کو قید اور اسکی جائداد کو ضبط کر لونگا، زمانہ قدیم میں مملکتِ ایران یا ان ممالک میں جو ایرانی علاقوں کے اطراف میں تھے، ان شرمناک بدزبانیوں کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی، ان کا رواج بدذات شاہ اسمٰعیل صفوی کے عہد میں ہوا، اور اُس کے جانشین اُسی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، یہاں تک کہ تبرا ترقی کرتا گیا، بدعت و زندقہ ہر طرف پھیل گیا، اور رخنے وسیع ہو گئے، یہ ۹۰۶ھ ہجری میں ہوا، ان نفرت انگیز باتوں کو شائع ہوئے تین سو برس گذر چکے ہیں،........"

شاہی فرمان کے نیچے اسی کاغذ پر ایک اقرار نامہ اہل ایران کی طرف سے درج تھا، وہ یہ تھا، "ہم لوگوں کو قبول ہے کہ صحابہ پر تبرا کہنا بالکل موقوف کر دیا جائے، ہم ان کی فضیلت اور ترتیبِ خلافت کو جیسا کہ اس دستاویز میں مذکور ہے تسلیم کرتے ہیں، ہم میں سے جو شخص تبرا کہے یا ان معاہدوں کے خلاف کچھ زبان سے نکالے اُس پر خدا کی لعنت، اسکے فرشتوں کی لعنت اور تمام نوع انسانی کی لعنت ہو، اور ہم لوگوں پر نادر شاہ کا غضب نازل ہو، اور ہماری جائداد، خون اور بال بچے اس کے لئے جائز ہو جائیں"،

ایرانیوں نے اس اقرار نامہ پر اپنی مہریں لگائیں، اس کے نیچے نجف، کربلا، حلات اور

خوارزم کے لوگوں کی طرف سے بھی ایک اقرار نامہ تھا، اس کا مضمون بھی وہی تھا جو اہل ایران کے اقرار نامہ کا، پھر اسکے نیچے افغانوں کی طرف سے حسب ذیل اقرار نامہ تھا:۔

"جب تک اہل ایران معاہدہ کے پابند رہیں گے، اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں گے اس وقت تک وہ اسلامی فرقوں میں شمار ہوں گے، اور ان کا نفع نقصان مسلمانوں کا نفع نقصان سمجھا جائے گا"۔

ان لوگوں نے بھی اپنے اقرار نامہ پر اپنی مہریں ثبت کیں، اس کے علاوہ علمائے ماوراء النہر کی طرف سے ایک اقرار نامہ تھا، جس کا مضمون افغانوں کے اقرار نامہ کے مثل تھا، انھوں نے بھی اپنی مہریں لگائیں، تب میں نے دستاویز کے سرے پر اپنی یہ شہادت درج کی:۔

"میں اس معاہدہ کی تصدیق کرتا ہوں جس پر تینوں جماعتوں نے اتفاق کیا ہے، اور اس پر پابند رہنے کا وعدہ کیا ہے، نیز اس امر کی کہ انھوں نے اپنے اس اقرار نامہ کا مجھے گواہ بنایا ہے"۔

نادرشاہ نے علامہ سویدی کو بلاکر ان کا شکریہ ادا کیا، اور مجلس کی کامیابی پر نہایت مسرت ظاہر کی، دوسرے روز جمعہ کو اسکے حکم سے کوفہ کی مسجد میں خلفائے اربعہ کے نام خطبہ میں بالترتیب پڑھے گئے، اور سلطان محمود خاں عثمانی اور اس کے بعد نادرشاہ کے لئے دعا کی گئی، نماز جہری طریقہ کے مطابق ادا ہوئی، پھر علامۂ موصوف کو بغداد واپس جانے کی اجازت ملی، اور ان کے ساتھ معاہدہ مذکورہ اور اس خطبہ کی ایک نقل بھی روانہ کی گئی،

"ع ز"

ہماری بادشاہی

لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، ضخامت ۱۲۰ صفحے، قیمت ۱؎ عمر "منیجر"

اخبار علمیہ

امریکہ میں قتل کی گرم بازاری

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں قتل کے واقعات کا اوسط تقریباً بارہ ہزار سالانہ رہتا ہے، اور یہ آب سے دس سال قبل کی بہ نسبت کم ہے، ڈاکٹر فریڈریک ہوفمین (Dr. Frederick Hoffman) ماہر اعداد و شمار کے بیان کے مطابق ۱۹۲۵ء میں مردم کشی کا اوسط (۱۱٫۲) فی لاکھ تھا جو ۱۹۲۵ء میں (۸٫۱) فی لاکھ تک اتر آیا، ۱۹۲۵ء کے بعد اس جرم کا سب سے زیادہ ارتکاب ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا جبکہ ریاستہائے متحدہ میں (۱۲۱۲۳) آدمی قتل کئے گئے تھے، یعنی (۹٫۶) فی لاکھ، ۱۹۲۶ء میں اوسط (۸٫۸) تھا، لیکن اسکے بعد کساد بازاری کے سالوں میں ترقی کرکے ۱۹۳۳ء میں (۹٫۶) تک پہنچ گیا، ۱۹۳۴ء سے اس میں پھر تخفیف ہو رہی ہے، لیکن اس تخفیف کے باوجود امریکہ میں قتل کے واقعات بہ نسبت دوسرے ملکوں کے اب بھی زیادہ ہوتے ہیں، مثلاً انگلستان اور ویلز میں مردم کشی کا اوسط ۱۹۳۴ء میں صرف (۶٫) فی لاکھ تھا، کناڈا میں (۱٫۳) اور اٹلی میں (۲) فی لاکھ، فن لینڈ میں البتہ ۱۹۳۲ء کا اوسط (۹) فی لاکھ تھا، اور رومانیا میں (۶٫۴) فی لاکھ،

اگرچہ بحیثیت مجموعی امریکہ میں قتل کے واقعات بہ نسبت پہلے کے اب کم ہو رہے ہیں، تاہم وہاں نوجوان قاتلوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے، دسمبر ۱۹۳۶ء میں نیویارک کے قیدخانہ سنگ سنگ (Sing Sing Prison.) میں قتل کے مجرموں کی تعداد جن کو سزائے موت کا

محکم ہو چکا تھا (۲۳) تھی، ان میں سے (۹) کی عمریں اکیس سال سے کم تھیں، بعض سترہ سال کے تھے، بعض اٹھارہ انیس اور بیس سال کے، ان سب نے روپیہ کی خاطر قتل کئے تھے، ان (۹) کے علاوہ بقیہ (۱۴) میں صرف دو کی عمریں اکتیس سال سے زیادہ تھیں، نیویارک کے علاوہ ریاستہائے متحدہ کے تمام دوسرے حصوں میں بھی ہزاروں نوجوان قاتل قیدخانوں میں بند ہیں، ۱۹۳۶ء کے پہلے نو مہینوں میں (۲۱) سال سے کم کے جو مجرم گرفتار کئے گئے، ان کی تعداد (۵۴۵۹۹) تھی، ان میں (۵۲۶) قتل کے مجرم تھے، ۱۹۳۶ء کے ان ہی مہینوں میں گرفتارشدہ مجرموں کی تعداد میں (۲۱) سال سے کم عمر والوں کا تناسب (۱۷) فی صدی تھا، ۱۹۳۵ء میں اور اس کے قبل چار سال تک (۱۹) سال کے مجرموں کی تعداد ہر عمر کے مجرموں کی انفرادی تعداد سے زیادہ تھی،

امریکہ میں قتل کی وبا اسقدر عام ہے کہ وہاں کے محکمۂ تفتیشِ جرائم کا ایک افسر جارج شٹیل (George Schattle.) بیان کرتا ہے، کہ "ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جو جرم سب سے زیادہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے، وہ مردم کشی کا جرم ہے"، اس کے پیش کردہ اعداد و شمار کی رو سے ہر سال تقریباً بارہ ہزار واقعات قتل کے ہوتے ہیں، لیکن گرفتاریاں صرف نو ہزار ہوتی ہیں، ان نو ہزار قیدیوں میں سے سزائے موت اوسطاً صرف (۱۱۰) کو ملتی ہے، قتل کے نشتر فی صدی واقعات میں جیوری سزائے موت کا فیصلہ صادر نہیں کرتی، یا مجرم بری کر دیئے جاتے ہیں، افسر مذکور کی رائے ہے، کہ قتل کی یہ گرم بازاری پبلک اور جیوری کی بیجا ہمدردی کی وجہ سے ہے، وہ لکھتا ہے کہ "قاتلوں کی گرفتاری کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے، جتنا ان کے اثباتِ جرم اور سزا کا"

جنگ جو کی امن پسندی اور نوبل انعام کا عطیہ

حال میں اوسلو (ناروے) کی نوبل پرائز کمیٹی نے اعلان کیا ہے، کہ ۱۹۳۵ء کا انعامِ امن (Peace Prize) کارل فان اوسٹیز کی (Karl von Ossietzky)

اور ۱۹۳۶ء کا کارلوس ساویدرا لاماس (Carlos Saavedra Lamas) وزیر خارجہ ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) کو عطا کیا گیا، یعنی کمیٹی مذکور کے نزدیک ان دونوں اشخاص نے دنیا میں تحریک امن کو ترقی دینے میں سب سے زیادہ سعی کی ہے، اور اس صلہ میں دنیا کے سب سے بڑے انعام نوبل پرائز کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں، اوسٹیز کی جنگ عظیم میں چار سال تک جرمن فوج کا ایک افسر رہ چکا ہے، اپنے تجربات کی بناپر وہ بعد میں جنگ کا مخالف ہوگیا، اور ایک اخبار نکال کر صلح و امن کی تبلیغ شد و مد کے ساتھ شروع کر دی، اس تبلیغ کے سلسلہ میں اس نے بعض ایسے مضامین بھی شائع کئے جن میں حکومت جرمنی کے فوجی معارف پر نہایت سخت اعتراضات کئے گئے تھے، چنانچہ حکومت نے اسے گرفتار کرکے دو سال کے لئے قید کر دیا، رہائی کے بعد جب ۱۹۳۳ء میں نازی حکومت برسراقتدار آئی، تو اس نے پھر اس داعیِ امن کو گرفتار کر لیا، ابھی حال میں وہ اپنی مدت پوری کرکے دوبارہ قید سے چھوٹا ہے، قید کے دوران ہی میں نوبل پرائز کمیٹی نے اس کے انعام کا اعلان کیا، اس مسئلہ پر کمیٹی کے ارکان میں شدید اختلاف تھا، چنانچہ کابینۂ ناروے کے دو ممبروں نے جو اس کمیٹی کے بھی رکن تھے، اس بناپر کمیٹی کی رکنیت سے استعفا دیدیا کہ اوسٹیز کی کو انعام دینے کی وجہ سے غیر حکومتوں کے جذبات اور اغراض پر برا اثر پڑے گا، برلن کا ایک سرکاری بیان نوبل کمیٹی کے اس فیصلہ کی نسبت لکھتا ہے، کہ "یہ ایک گستاخانہ اشتعال انگیزی، اور جدید جرمنی کے لئے ایک توہین ہے" اوسٹیز کی کے متعلق بیان مذکور میں ہے کہ "وہ اپنے وطن کا غدار ہے، جس کے جرم کا فتویٰ ملک کی سب سے بڑی عدالت صادر کر چکی ہے"، قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت جرمنی اوسٹیز کی کو نہ تو انعام وصول کرنے کی اجازت دے گی، اور نہ ملک سے باہر جانے کی، نازی حکومت کی طرح اٹلی کی فاسستی حکومت میں بھی ان دونوں انعاموں پر سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، روما کا اخبار لاوورو فاسستا (Lavoro Fascista) لاماس کو ایک آتش انگیز، جہاں سوز

کا لقب دیتا ہے، حالانکہ گذشتہ سال ہی نازی گورنمنٹ اُسے توسیعِ امن کی خدمت کے صلہ میں جرمن صلیب احمر کا تمغہ عطا کیا تھا،

ایک عجیب مرض

امریکہ میں ایک شخص ہانس نلسن (Hans Nelson.) نامی ہے، جو ایک عجیب و غریب مرض کا شکار ہو گیا ہے، اب سے تیرہ برس پہلے اس کا وزن (۱۹۰) پونڈ اور قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ تھا، پھر کسی لامعلوم سبب سے اس کا قد اور بدن کم ہونا شروع ہوا، یہان تک کہ گذشتہ دسمبر میں اسکا قد صرف پانچ فٹ اور وزن (۱۵۵) پونڈ رہ گیا، یعنی اس کا قد تقریباً ایک انچ ہر سال گھٹتا گیا، پچھلے سال اس نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، اونھوں نے اوسٹیو ملیشیا (Osteomalacia) کا مرض تجویز کیا، یہ مرض گردن کے چار خاص غدودوں کی خرابی سے پیدا ہو جاتا ہے، ان کو پراتھی رائڈ گلینڈز (Parathyroid Glands) کہتے ہیں، یہ چاول کے برابر ہوتے ہیں، جب انکا فعل خراب ہو جاتا ہے، تو ہڈیوں میں چونے کی مقدار کم ہونے لگتی ہے، اور وہ نرم ہو کر سکڑنے لگتی ہیں، اسی وجہ سے قد بھی کم ہونے لگتا ہے، تکان رہتا ہے، اور وزن اور قوت میں کمی آجاتی ہے،

ڈاکٹروں نے نلسن کے لئے جو پرہیزی غذا تجویز کی ہے، اس سے کافی فائدہ معلوم ہوتا ہے، وہ غذا یہ ہے، پھل، ترکاریاں، دودھ، مچھلی کا تیل، چنانچہ گذشتہ دسمبر میں اس کا وزن (۱۵) پونڈ بڑھ گیا، قوت بھی آگئی، اور وہ اس قابل ہو گیا، کہ خود موٹر چلا سکے، اسکے معالج ڈاکٹروں کا خیال ہے، کہ اب اس کا قد کم نہ ہوگا، لیکن چونکہ اسکی عمر (۵۲) سال کی ہو چکی ہے، اسلئے قد کے دوبارہ بڑھنے کی امید نہیں، یہ غدود اعصاب کی صحت کے لئے بھی نہایت ضروری ہیں، ان کی خرابی سے احساس میں ہیجان پیدا ہو جاتی ہے، اور ذرا ذرا سی بات پر مریض بے قابو ہو جاتا ہے،

"ع ز"

ادبیات

داغِ جگر

از جناب جگر مرادآبادی،

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

کوے جاناں کی ہوا تک سے بھی تھراتا ہوں میں
کیا کروں؟ بے اختیارانہ چلا جاتا ہوں میں

آکہ تجھ بن، اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یک بیک گھبرا کے جتنی دور ہٹ آتا ہوں میں
اور بھی اُس شوخ کو نزدیک تر پاتا ہوں میں

جب مکان و لامکاں سب سے گذر جاتا ہوں میں
اللہ اللہ تجھ کو، خود، اپنی جگہ پاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو، مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں

حسن کو کیا دشمنی ہے، عشق کو کیا بیر ہے؟
اپنے ہی قدموں کی خود ہی ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

ہائے رے مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

تیری محفل، تیرے جلوے، پھر تقاضا کیا ضرور
لے اٹھا جاتا ہوں ظالم لے چلا جاتا ہوں میں

تاکجا یہ پردہ داری ہاے عشق و لاف حسن
ہاں سنبھل جائیں دو عالم ہوش میں آتا ہوں میں

میری ہمت دیکھنا، میری طبیعت دیکھنا
جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر کے الجھاتا ہوں میں

دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا
وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں

دل مجسّم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو — کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

یاد ایاّمے کہ ہر ہر سانس تھا لب ریز شوق — اب تو نام آرزو بھی سن کے تھرّاتا ہوں میں

تیری اک آنکھوں کا ساغر تیرا اک رُخ کی بہار — یہ میسّر ہوں تو ہر جنّت کو ٹھکراتا ہوں میں

تاکجا دردِ محبت، تا کجا دردِ فراق — رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کہلاتا ہوں میں

میری خاطر اب وہ تمکینِ تجلی کیوں کریں — اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں

تو فنا آمادہ ہے تجھ کو نظر آتی ہے موت — زندگی، تابندگی، پایندگی پاتا ہوں میں

واہ رے شوقِ شہادت کوئے قاتل کی طرف — گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگرؔ،
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں،

(۱) اس کی نرگسی آنکھوں کا ساغر ایک ہی سانس میں پی جانا،

بیانِ حقیقت

ازجناب سید شاہ عبد العلی صاحب تجرؔ،

حیرت کدۂ دہر میں کیا دیکھ رہا ہوں، — غارت گری کارِ قضا دیکھ رہا ہوں،

حیران ہوں یا آج میں کیا دیکھ رہا ہوں، — انسان کی صورت میں خدا دیکھ رہا ہوں

کیا چیز ہے سردوشِ فنا دیکھ رہا ہوں، — اپنے لئے سامانِ بقا دیکھ رہا ہوں

اک عالمِ حیرت ہے مرا دیدۂ بینا، — ذرّوں میں خدا جانئے کیا دیکھ رہا ہوں

ملتا نہیں ڈھونڈے سے بھی جو دیر و حرم میں — میں دل میں اُسے جلوہ نما دیکھ رہا ہوں

کیا پوچھتے ہو حیرتِ نظّارہ کا عالم — ہر شے کو ہم آغوشِ فنا دیکھ رہا ہوں

ہر چند کہ آنکھیں ہیں مری محوِ تماشا — میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں

موسیٰ کی نگاہیں تو تھیں محدودِ تجلّی، — میں اور کچھ اس سے بھی سوا دیکھ رہا ہوں

ساحل پہ کھڑا بحر میں لہروں کی فضا میں
تاروں کے چمکنے کی ادا دیکھ رہا ہوں،

نقوشِ جذبات

ازجناب حبیب صاحب اشعرؔ دہلوی،

مداوائے دردِ جگر چاہتا ہوں — کوئی نشتر کارگر چاہتا ہوں،

نگاہِ حقیقت نگر چاہتا ہوں — میں جلووں سے پہلے نظر چاہتا ہوں

مزہ مل گیا مجھ کو ناکامیوں کا — میں اب آہ بھی بے اثر چاہتا ہوں

نشیمن کی تعمیر وہ بھی چمن میں — گرے مجھ پہ بجلی اگر چاہتا ہوں

قیودِ دو عالم سے آزاد ہو کر — تمھیں تم کو پیشِ نظر چاہتا ہوں،

مجھے ظلمتوں میں بھی تسکینِ دل ہے — میں اب شام بھی بے سحر چاہتا ہوں،

سزا بھی جزا بھی فنا بھی بقا بھی — تری ذات پر منحصر چاہتا ہوں

کوئی حد ہے اس جوشِ وحشت کی اشعرؔ
بیاباں کی مانند گھر چاہتا ہوں،

کلیاتِ شبلی اردو،

بَابُ التَّقرِیظِ وَالانتِقَاد

جہانِ آرزو

مصنفہ جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۲۶۰ صفحے، قیمت عہ

پتہ روزنامہ حقیقت لکھنؤ،

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

حکیم سید ضامن علی جلال لکھنو کے اُن شعرا میں تھے، جنھوں نے سب سے پہلے لکھنو کی شاعری مین انقلاب پیدا کیا، اور خارجی مضامین یعنی خال وخط، زلف وکاکل اور مجرم اور دوپٹہ کو چھوڑ کر جذبات وواردات کو اپنا سرمایۂ تغزل بنایا، اون کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی، اور ان میں سید انور حسین آرزو نے اس روش کو اسقدر ترقی دی، کہ اب اُن کا شمار دورِ جدید کے شعرا میں کیا جاتا ہے، اس جدید رنگ میں ان کا دوسرا دیوان جو جہانِ آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے، ہمارے پیشِ نظر ہے، اور اسکے دیکھنے سے انکے کلام کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہین،

۱- وہ بہت سی غزلوں میں نامانوس قافیے استعمال کرتے ہیں، جن کی تعداد محدود ہوتی ہے، اور اس وجہ سے شعرا غزلون میں ان قافیون کو بہت کم استعمال کرتے ہیں، مثلاً

یہ وہ لَو نہیں کہ بجھ جائے جو دل کو سوزِ غم سے لاگ ہو،

جل اٹھی ہیزم تو پھر ہیزم نہیں ہے آگ ہے،

کم التفات پہ بھی شوق دل کو سیری ہے، گھٹا درخت نہ جو پھانوں تو گھیری ہو،

دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زباں کیلی ہو، سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہو،

ہمکو تو حسرت ہیں کبھی عزت انکو ضد کہ خفیف کرو، ڈھائیں ستم اور اُسپہ ستم یہ کہتے ہیں تعریف کرو

۲- بہت سی غزلون میں نامانوس بحریں اختیار کرتے ہیں، مثلاً

کیوں وادیِ ایمن کے پھیرے کیوں طور کو آنا جانا ہے،

میں نے نہیں بھی کب کہا گر یہ کہا نہیں کہ ہے،

سپید وسیاہ ایک ہی ہیں، تو مجھو نظر نظر ہی نہین،

دے کے فریب لے کے دل کہتے ہیں حیلہ ساز ہو،

۳- اس قسم کی بحروں میں بعض غزلیں ایسی ہیں، جن کا مضمون بجائے ایک شعر کے دو شعروں میں تمام ہوتا ہے، اور آخری شعر میں قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے، مثلاً

ہے راہِ ہوس وہ طولانی، حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے،

ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی، آخر منزل ناکامی ہے،

اس باغ میں آکر ہم کو بھی تقدیر ملی ہے قمری کی،

بندش بازو میں اطاعت کی،

گردن میں طوقِ غلامی ہے،

میں ہوں تیرا خلوتیِ ازل مجھے کام منظرِ عام سے،

سرِ بام جلوہ ہے ضو فگن نظر آگے رفعتِ بام سے،

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے،

کوئی گردش ایسی بھی اے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے،

نہ قفس نصیب نہ آشیان، ہے میانِ برزخِ این و آن

ابھی پر شکستہ ہے مرغِ جان

کہ پھڑک کے نکلا ہے دام سے،

ان خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں حُسنِ تغزّل سے معرّا ہیں، اس کے ساتھ انھون نے اس جدید کوچے میں بے تکلف قدم رکھا ہے، اور لکھنو کے دائرے سے نکلنے کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ سرے سے عاشقانہ مضامین ہی ترک کر دیئے جائیں، حکیم جلال نے بے شبہہ مبتذل اور خارجی مضامین کو جو غزل سے تعلق نہیں رکھتے ترک کر دیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اونھون نے حدودِ تغزل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، لیکن سید انور حسین آرزو کے بہت سے اشعار پڑھتے چلے جائیے، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں، ایک پوری غزل ملاحظہ ہو،

مانگ جو کھو کے آن بان نہ مانگ	قتل ہو جا مگر امان نہ مانگ،
دیکھ پیمان شکن زبان نہ مانگ	بعد کو پھیر دے کے جان نہ مانگ،
صرف اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے	ایک شے مانگ دوجہان نہ مانگ،
روح پرور ہے کاہشِ غمِ دل	موت ہو ہو کے بدگمان نہ مانگ،
ظلم سے بھاگتے نہیں حق گو،	دار کافی ہے ریسمان نہ مانگ،
دینے والے سے تو ہے کم ہمت	خود اُسے مانگ لے جہان نہ مانگ،
جان کر جان دی نہیں جاتی،	ہو ن وضی بات کا زیان نہ مانگ،
بیدلی میں دکھاؤں دل کیونکر	نہیں جو شے وہ میری جان نہ مانگ،

آرزو یہ طلب ہے بے معنی

ہند میں رہ کے اصفہان نہ مانگ،

باوجودیکہ ان کے کلام میں اغلاق و ابہام نہیں ہوتا، شعرائے دورِ جدید کی طرح مصنوعی نادر ترکیبیں بھی استعمال نہیں کرتے، تصوف و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل بھی نظم نہیں کرتے، لیکن بایں ہمہ اس قسم کے پھیکے اور بدمزہ اشعار سے ان کا یہ دیوان بھرا ہوا ہے، البتہ کہیں کہیں معیارِ تغزل کے مطابق کچھ اشعار بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں، اور انہی کو اس دیوان کا حاصل سمجھنا چاہئے، ان کی مثالیں یہ ہیں،

ساقیا چشمِ کرم کا وقت ہوگا کونسا	جامِ دل خالی ہے جامِ زندگی لبریز ہے
ناتوانی نے کیا گم ترے دیوانے کو	اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے،
آپ کا نقشِ قدم میرا خطِ پیشانی	ایک ہی ہاتھ کی تحریر نظر آتی ہے
آگیا وقتِ رہائی ترے دیوانے کا	سانس، ٹوٹی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے

آرزو خواب بھی وحشی کے ہیں کیا وحشتناک

کبھی بیڑی، کبھی زنجیر نظر آتی ہے،

بات تجھ میں بھی اے ادائے سکوت	لبِ حاضر جواب کی سی ہے،
کیفیت میری اُن کی چپ میں بھی	کچھ سوال و جواب کی سی ہے،
ابھی تمہیدِ غمِ دل ہے یہ اُف اُف کیسی	جس کا ہر لفظ ہے شعلہ وہ بیان باقی ہے
غفلت میں ہے وہ جس کیلئے جاگ رہا ہوں	آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اڑی ہے
اخفائے رازِ شانِ وفا، امتحانِ صبر	آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کئے
بسکہ طولِ ہجر سے افزوں ہے طولِ انتظار	آپ کا اقرار بھی انکار ہے میرے لئے
میرے ہی آنسوؤں سے دھو ڈالو خونِ میر	دامن سے کچھ نچوڑ دیکھ لیلو آستین سے

———

مطبوعات جدیدہ

داغ مؤلفہ جناب نور اللہ محمد نوری صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ سپید کتابت و طباعت بہتر، قیمت انگریزی سکہ سے عہ عثمانی سے عہ، پتہ: غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چارکمان حیدر آباد دکن، اور شاخ عابد روڈ بک اسٹال جامعہ عثمانیہ،

داغ کی شوخیاں موجودہ شاعری سے ہم آہنگ نہیں، اس لئے ان کے محاسن کلام بھی نئے طبقہ کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں، جناب نور اللہ محمد نوری صاحب کی یہ کوشش لائق ستایش ہے کہ انھوں نے داغ کی شاعری پر نہایت جامع اور مبسوط تبصرہ کرکے ان کے کلام کے تمام پہلوؤں کو اس طرح دکھایا ہے، کہ انکی شاعری کی حقیقت اور اس دور کے شعرا میں داغ کا درجہ واضح ہوجاتا ہے، مثلاً داغ کا ماحول ان کی شاعری کے محرکات، خاص خاص مواقع کا کلام، انکی شاعری کا مقصد، ان کا فلسفۂ زندگی، ان کی شاعری میں مقامی عنصر، موسموں کا سمان، داغ کے کلام کا تجزیہ بلحاظ اصناف سخن، اور بلحاظ مضامین، اسلوب بیان، ہندوستانی زبان میں داغ کا تعمیری حصہ وغیرہ تمام مباحث کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ دکھایا ہے، آخری بحث میں کسی قدر مبالغہ کا رنگ آگیا ہے، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ کتاب داغ کی شاعری پر نہایت اچھا تبصرہ ہے، ابتدا میں داغ کے مختصر حالات اور آخر میں انکے چند مشاہیر تلامذہ کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، اس کتاب میں ضمنی طور سے مصنف نے کہیں کہیں اجتماعیات کے نکتوں کی طرف اشارے کئے ہیں، ان سے مصنف کی بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے، اگر وہ اس موضوع کی طرف توجہ کریں، تو زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں،

گل عجائب شائع کردہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۰۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عمہ، پتہ انجمن ترقی اردو،

انجمن ترقی اردو اس سے قبل شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ شائع کرچکی ہے، اب اس نے شفیق کے ایک اور ہم وطن اور معاصر شاعر اسد علی خان تمنا کا تذکرہ گل عجائب شائع کیا ہے، تمنا بارھوین صدی ہجری کا شاعر ہے، اس کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، لیکن خود اس تذکرہ سے اسکے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس تذکرہ میں بارھوین صدی کے اواخر کے ترپن ۵۳ دکنی شعرا کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، ایک آدھ شمالی ہند کے شعرا کے حالات بھی ہیں، اگرچہ یہ حالات اتنے مختصر ہیں کہ بعض شعرا کا صرف نام و تخلص ہے، اور معلومات میں بھی اس سے کوئی نیا اضافہ نہیں ہوتا، تاہم ایک قدیم تذکرہ کی حیثیت سے لائق قدر ہے،

رسالہ دینیات حصہ پنجم، ششم و ہفتم مرتبہ مجلس نصاب کتب شعبہ دینیات و اخلاقیات سررشتہ تعلیمات حیدر آباد دکن تقطیع اوسط ضخامت علی الترتیب ۱۰۸، ۱۲۰، اور ۹۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۹ ر ۱۲ ر ۱۲ ر پانچویں اور چھٹے حصہ کے ملنے کا پتہ مولوی محمد فخر الدین ہاشم صاحب فاروقی، مالک مطبع قاسمی نظام شاہی روڈ حیدر آباد دکن، ساتواں حصہ سید عبد القادر تاجر کتب چارمینار حیدر آباد دکن سے ملے گا،

یہ تینوں رسالے حیدر آباد کے سررشتۂ تعلیم کے سلسلۂ دینیات کی کڑی ہیں، پانچویں حصہ میں اللہ توحید، رسالت کی تشریح، انبیاء، خاتم الانبیاء، اور ان کے متعلق ضروری عقائد، اللہ کی کتابوں، کلام اللہ اور اس کی خصوصیت، اور ملائکہ اور قیامت کے مختصر حالات ہیں، پھر برائیوں میں جھوٹ، غیبت اور چوری، اور بھلائیوں میں توبہ، زہد اور تقوی کا بیان ہے، آخر میں آنحضرت صلعم کے مختصر حالات ہیں، چھٹے حصہ میں ارکان اسلام، اصطلاحات فقہ کی تشریح، طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور

حج کے جملہ ضروری مسائل ہیں، پھر صحت جسمانی کی ضرورت اس کے فوائد، حلال وحرام چیزون کی تشریح، نشہ اور جوئے کی بُرائیان اور توکّل وصبر کی تشریح اور اسکی خوبیان بیان کی گئی ہیں، آخر میں خلفاے راشدین کے مختصر حالات ہیں، ساتوین حصہ میں تسلیم ورضا، عبدیت وکسبِ حلال کی دلنشیں تشریح، ان کے فوائد، ان کے حصول کی ترغیب اور قتلِ ناحق، سود اور ریاکاری کی وضاحت اور ان کے ترک کی تعلیم ہے، آخر میں چند اکابر مہاجر وانصار صحابہ کے مختصر حالات ہیں، تینون رسالے نہایت مفید ہیں، ان میں جملہ ضروری مذہبی معلومات کا نہایت خوبی سے استقصار کیا گیا ہے، اندازِ بیان دلنشین ہے،

تاریخِ اسلام

مؤلفہ جناب برکت اللہ صاحب فاروقی اصلاحی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸/ ملنے کا پتہ اسلامیہ کتب خانہ نمبر ۲۰۵ و بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳،

یہ مختصر تاریخ مکاتب اسلامیہ کے بچّوں کی ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں سیرت پاک کے کسی قدر تفصیلی اور خلفاءِ اربعہ کے ضروری مختصر حالات ہیں جو بچون کے لئے کافی ہیں،

پنڈوہ

از جناب شاہ حسن الدین احمد صاحب منعمی ابو العلائی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۳ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- ۶/ پتہ شاہ حسن الدین احمد صاحب خانقاہ منعمی ابو العلائی گیا،

پنڈوہ اور لکھنوتی بنگال کے نہایت قدیم مگر ویران شہر ہیں، اسلامی عہد کے بعض دورون میں بھی ان کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے، یہان متعدد اولیائے کرام کے مزارات اور دوسرے اسلامی آثار ہیں، شاہ حسن الدین احمد صاحب نے ان کی زیارت کرکے یہان کے حالات معارف میں لکھے تھے جنھیں اب انھون نے رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے، اور بعض مزارات اور آثار کے فوٹو بھی دیدیئے ہیں،

زادِ راہ

مصنفہ منشی پریم چند، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۴ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت روشن، قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

زادِ راہ منشی پریم چند کے پندرہ افسانون کا مجموعہ ہے، "وفا کی دیوی"، "زیور کا ڈبّہ"، "آشیان برباد"

"خدا کا قہر"، "فریب"، "لاٹری"، "نیور"، "لعنت"، "بڑے بھائی صاحب"، "مس پدما"، "بولی کی چھٹی"، "زادِ راہ"، "حقیقت"، "ڈامل کا قیدی"، ان تمام فسانون میں منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات نمایاں ہیں، کوئی افسانہ کسی مفید تعلیم ونتیجہ سے خالی نہیں،

ہتیا اور دوسرے افسانے

مصنفہ جناب مجنون گورکھپوری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مذکور نہیں، پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

یہ جناب مجنون گورکھپوری کے افسانون کا تیسرا مجموعہ ہے، اس میں آٹھ افسانے ہیں، "ہتیا"، "گہنا"، "حسین کا انجام"، "مراد"، "جشن عروسی"، "بڑھاپا"، "کلثوم"، "محبت کا دمِ واپسین" ان میں سے کچھ طبعزاد ہیں، اور کچھ دوسری زبانون سے ماخوذ ہیں، لیکن سب پڑھنے کے لائق ہین، اور مجنون صاحب کا المیہ رنگ تقریباً سب میں نمایان ہے،

یادگارِ ماجد

مؤلفہ جناب سیّد طالب علی صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۲ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت قسم عام ۱۲/ قسم خاص عہ/ پتہ سید طالب علی ایم اے شاہ گنج الہ آباد،

سیّد ماجد علی صاحب مرحوم ایڈوکیٹ الہ آباد نے اگرچہ بحیثیت شاعر کے کوئی شہرت حاصل نہین کی، لیکن وہ اس دور کے خوشگو شعراء میں تھے، اور انکی شاعری قدیم اور جدید رنگ کی آمیزش کا خوشرنگ مجموعہ تھی، وہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، غزلون کے علاوہ منقبت میں ان کے جوہر زیادہ چمکتے تھے، ان کے لائق بھتیجے سیّد طالب علی صاحب ایم اے نے یادگارِ ماجد کے نام سے ان کی غزلون کا مجموعہ شائع کیا ہے، ابتدا میں پنڈت منوہر لال زتشی کا تعارف ہے، اس کے بعد فاضل مرتب نے سید ماجد علی کے مختصر حالات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے، دیوان میں بیشتر حصہ غزلون کا ہے، آخر میں خاص خاص موضوع پر چند نظمین ہین، غزلون کی ترتیب ردیف وار کے بجائے تاریخی ہے،

جس سے شاعر کے کلام کی تدریجی ترقی کا پتہ چلتا ہے،

مقام محمود، از جناب آغا محمد صدیق حسن صاحب ضیا تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۸ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، **قیمت:-** ۸؍ پتہ مستری غلام نبی صاحب کامل کوچہ مستریاں، راولپنڈی،

یہ ایک نعتیہ مثنوی ہے، جس میں جناب ضیا نے حسن وعشق کی زبان میں ظہور آدم سے لیکر ظہور قدسی تک کے مختلف مدارج واحوال دکھائے ہیں، ہر بیان نیاز عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، وفور جذبات میں کہیں نظم کا دامن تنگ ہو گیا ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق عقیدت کے ان پھولوں سے لطف اندوز ہوں گے،

حمید کے سو شعر، از جناب خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی تقطیع جیبی صفحات ۲۲، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۴؍ علاوہ محصول ڈاک، پتہ منیجر نامی پریس لکھنؤ،

خواجہ حمید الدین صاحب لکھنؤ کے ہونہار شعراء میں ہیں، اور اس سے پہلے ان کا دیوان پرواز خیال منظر عام پر آچکا ہے، اب انھوں نے اپنے سو شعروں کا انتخاب شائع کیا ہے، یہ انتخاب لکھنؤ کے نامور شاعر مرزا ثاقب کے حسن انتخاب کا نتیجہ ہے جو امید ہے کہ ارباب ذوق میں مقبول ہوگا،

دل صد پارہ، از جناب محمد عباس صاحب طالب صفوی تقطیع جیبی ضخامت ۴۶ صفحات، کاغذ سپید، کتابت وطباعت اوسط قیمت ۲؍ ٹکٹ پر مصنف سے شمس آباد ضلع فرخ آباد سے ملیگی،

دل صد پارہ جناب محمد عباس صاحب صفوی کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے، ابتک اس قسم کے انتخابات سو شعر کے نام سے چھپتے تھے، لیکن جناب صفوی کی شاعرانہ جدت نے اسکو دل صد پارہ کے نام سے بدل دیا، جو ممکن ہے آئندہ چل جائے، صفوی صاحب کی شاعری کی کلی ابھی نو شگفتہ ہے، لیکن رنگ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر اسکی آبیاری جاری رہی، تو اسکی نگہت بہت جلد پھوٹ نکلے گی،

جلد ۳۹	ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۷ء	عدد ۳

مضامین